

مجلس یادگارِ ضیاء

ضیاء

ترتیب

قاضی عبدالحلیم اثر

ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری

مجلسِ یادگارِ ضیاء

ضیاء

بیادِ سید ضیاء جعفری

ترتیب

قاضی عبدالحلیم اثر — ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری

منتظم

سید حیات جعفری

شمارہ ۱۶

مئی ۱۹۷۱

قیمت :- ۶ چھ روپے

مطبوعہ

منظورِ عام برقی پریس پشاور

کتابت

مولانا محمد اسرائیل

ضیاء

مندرجات

حصہ اول

منظومات

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدا ئیہا شکایت می کند

جدائی کا ایک المناک اور کربناک سال گذر گیا۔ اور جدائی بھی ایسی کہ ایک شخص کے اٹھ جانے سے کئی عزیزوں کے کھو جانے کا احساس ہوا۔ قبلہ سید ضیا جعفری سے باپ بیٹا ہونے کے علاوہ کچھ اور تعلقات اور رشتے بھی تھے۔ وہ میرے دوست۔ میرے رہنما۔ میرے ہادی۔ میرے غمگسار۔ میرے رہبر اور میرے معشوق و محبوب تھے۔ جس ہستی کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ تھا۔ اس نے ۷، ربیع الاول کی ایک منحوس اور تاریک رات کو دم بھر میں ساتھ چھوڑ دیا۔ اور میں اس حادثے سے دو چار ہونے کے لئے نہ تیار تھا۔ اور نہ مجھ میں سکت تھی لیکن یہ حادثہ برداشت کرنا پڑا۔ اور کیا۔ اور اس طرح ایک سال گذر گیا جس میں گرمی کی تپتی دوپہریں بھی شامل تھیں۔ اور سردی کی طویل راتیں بھی۔ خزاں کی بے لطف شامیں بھی۔ اور بہار کے مہکتے ہوئے سویرے بھی۔ لیکن اس پورے ایک سال میں ایک دن۔ ایک لمحہ اور ایک پل بھی اس محبوب کی یاد سے غافل نہ رہا۔ بقولِ غالب

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اس صدمے۔ اس غم اور اس اندوہ کے ساتھ مجھ پر ایک دم سے کئی ذمہ داریاں عائد ہوئیں۔ بہنوں کی تسلی۔ حیات کی تشفی۔ مریدین کو سنبھالنا۔ مرقد منور کی تعمیر۔ دربارِ عالیہ فاضلیہ سے تعلق۔ یہ سب بار میں نے اٹھائے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ سب کچھ تصرف تھا۔ ان کا اور نظر تھی ان کی جنہوں نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ ورنہ قبلہ سے اس تعلق کے ایک دم ٹوٹ جانے سے اگر میرا دماغی توازن قائم نہ رہتا تو میں حق بجانب ہوتا۔

ہیں نے ان ذمہ داریوں کو مقدور بھر سنبھالنے کی سعی کی۔ بہنوں کو تسلی دیگران کے غم کو بھی اپنے سینے ہیں جگہ دی۔ حیات کی زندگی ہیں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ مریدینِ قبلہ کو سنبھالا۔ اگرچہ ہیں سرتاپا گنہگار اس قابل نہ تھا۔ اور نہ ہوں۔ کہ اس مسندِ عالی پر بیٹھ سکوں جسے قبلہ نے ایک زمانے کے زہد و ریاضت اور شب بیداری کے بعد حاصل کیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر دل کو تشفی دیتا ہوں۔ کہ اس کی سند ہے۔ جس نے ایک نگاہِ کرم سے چور کو ولی بنا دیا۔ اگر مجھ چور پر نظرِ عنایت ہو جائے۔ تو شاید میری آرزوؤں کا باغ بھی مہک جائے۔ اور یہ ان سے دور نہیں۔ بس صرف یہی ایک آرزو ہے۔ جس کے سہارے قبلہ کی اس مسندِ پاک کو سنبھالے ہوئے ہوں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم

قبلہ کے مزار کے سلسلے ہیں ہیں تو سمجھتا ہوں۔ کہ ہمیں بہت حد تک کامیابی ہوئی۔ یہ کامیابی بھی ہماری نہیں۔ یہ ان کا اپنا تصرف ہے۔ کہ انہوں نے ایک بے برگ و گیا صحرا کو اپنے مرقد سے منور کر کے گل و گلزار بنا دیا۔ میرے ساتھ قبلہ کے مریدین۔ احباب اور اہلِ خانہ نے اس سلسلے ہیں بے حد تعاون کیا۔ اور ان کے تعاون سے ہیں اس قابل ہوا۔ کہ آج ان کا مرقد مبارک اس قابل ہے۔ کہ عقیدت مند یہاں بیٹھ کر سرما کے باد و باران اور گرما کی کڑی دھوپ سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری ہے۔

خانقاہ عالیہ فاضلیہ سے رشتہ خدا کے فضل و کرم سے اس طرح قائم ہے۔ جس طرح قبلہ کی زندگی ہیں تھا۔ ان کے وصال کے دو ہفتے بعد دہم ربیع الثانی۔ دربارِ عالیہ قادریہ میں حضرت میراںؒ سرکار کا عرس ہوا۔ قبلہ کی خواہش اور تمنا کے مطابق ان کے پشاور کے مریدین کو ساتھ لیکر لاہور پہنچا۔ کراچی۔ لاہور اور راولپنڈی کے مریدین وہاں جمع ہو گئے۔ اور عرس ہیں اس طرح شرکت کی۔ جس طرح ہر سال ان کی زندگی ہیں کیا کرتے تھے۔ ان کی بجائے عزیزی حیات جعفری نے نظم پڑھی۔ اور آغا جی نے ۱۹۲۶ سے ۱۹۶۹ تک بیالیس سال تک جو اس بارگاہ میں نظم پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس وضع کو بھی قائم رکھا اور انشاءاللہ اس سال بھی اسی طرح مریدوں اور ساتھیوں کے ساتھ عرس مبارک پر حاضری ہو گی۔ قبلہ و کعبہ حضرت سید محمد محی الدین سجادہ نشین دربارِ عالیہ فاضلیہ قادریہ کی

قدمبوسی ہوگی۔ اور رشد و ہدایت کے اس سمندر سے فیضیاب ہونے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔

جدائی کی یہ تاریک راتیں۔ تپتی دوپہریں۔ طویل لمحے اور المناک ساعتیں جن لوگوں کے سہارے۔ تسلی اور تعاون سے گذاردیں۔ اگر اس موقع پر ان کا شکریہ ادا نہ کروں۔ تو ناانصافی ہوگی۔ قبلہ کے انتقال کے ساتھ ہی تاروں کا سلسلہ۔ خطوں کی بوچھاڑ۔ تعزیتی پیغامات کا تانتا اور احباب۔ اعزاء۔ عقیدت مندوں اور دوستوں کا بہ نفسِ نفیس خود تشریف لانا۔ ایسے سہارے تھے۔ جن کی وجہ سے ان کرب کے لمحوں میں میں تنہا نہ تھا۔ میرے ساتھ۔ ضیاء جعفری کے عقیدت مندوں کے دل اور ان کے احباب کی آنکھیں رو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں یہاں کے مقامی اور بیرونی اخبارات اور رسائل اور ریڈیو پاکستان پشاور نے اپنے ضیاء کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ان کے انتقال کی خبر کے علاوہ ان کی تصویریں چھاپیں۔ لوگوں کے تعزیتی بیان چھاپے۔ اور ان کے بارے میں ان کے دوستوں اور عقیدتمندوں کے تأثرات وقتاً فوقتاً چھاپتے رہے۔ اور اس کام میں سب سے زیادہ تعاون روزنامہ مشرق نے کیا۔ اور مسعود انور شفقی پر ضیاء جعفری کا جو حق تھا۔ اُسے پوری طرح ادا کیا۔

اخبارات کے علاوہ یہاں کی ادبی انجمنوں نے اپنے ضیاء کو جو تقریباً نصف صدی تک ان انجمنوں کی رونق اور زندگی رہا۔ جس کی وجہ سے ان انجمنوں میں جان اور گہماگہمی رہی۔ جس نے ان انجمنوں کو رونق اور ہنگامے بخشے۔ کی یادیں منائیں۔ جلسے کئے۔ جن میں پاکستان رائٹرز گلڈ پشاور۔ انجمن ترقی اردو پشاور۔ اباسین آرٹ سوسائٹی پشاور دائرہ ادبیہ پشاور۔ خانہ فرہنگ ایران۔ انجمن اردو۔ شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی اور انجمن ترقی اردو کوہاٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اور میں ان کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

جن لوگوں نے قبلہ کی زندگی۔ اور فن پر مقالات سے اس شیرازے کو مزین کیا۔ مجھے حق نہیں پہنچتا۔ کہ میں ان کا شکریہ ادا کروں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں۔ کہ ضیاء مجھ سے زیادہ ان کا تھا۔ انہوں نے اپنے ضیاء کے بارے میں جو کچھ کہا۔ یہ ان کی اپنی عقیدت

اور محبت ہے۔ جو اس مردِ باخدا اور رونق محفل احباب کے اُن سے بچھڑ جانے کے بعد بھی قائم رہے گا۔ مجھے تو صرف یہ سعادت حاصل ہے۔ کہ میں نے ان انمول موتیوں کو ایک لڑی میں پرویا۔ یہ ادبی ہار جس میں خلوص محبت اور عقیدت کے سدا بہار پھول پروئے گئے ہیں۔ حضرت کی خدمت میں ان کی پہلی برسی پر پیش کر رہا ہوں۔

۲۳ رمئی ۱۹۷۱ء

سیّد مرتضیٰ جعفری

ڈاکٹر محمد شمس الدین صاحب صدیقی۔

سید ضیا جعفری مرحوم: چند تاثرات

تقریباً پندرہ سال قبل کی بات ہے کہ میں اپنے شفیق بزرگ اور دوست پروفیسر محمد طاہر فاروقی صاحب کی معیت میں پہلی مرتبہ سید ضیار جعفری مرحوم سے اُن کے مطب میں ملا تھا۔ مجھے اُس دن کی صحبت خوب یاد ہے۔ کچھ شعر و شاعری کی باتیں ہوئی تھیں اور کچھ لطیفے۔ اس پہلی ملاقات ہی میں ضیار صاحب کی خوش ذوقی اور بذلہ سنجی سے بھی متاثر ہوا تھا۔ اور اُن کی شفقت اور قدیم وضعداری سے بھی۔ اس کے بعد کئی دفعہ اُن کے دولت کدے پر کسی نہ کسی تقریب کے سلسلے میں جانے کا موقع ملا۔ اور کئی مرتبہ وہ خود میرے ہاں یا شعبۂ اردو میں تشریف لائے۔ اسس طرح انھیں قریب سے دیکھنے اور اُن کی باتیں خود اپنے کانوں سننے کے بیشمار مواقع ملے۔ اور ہر ملاقات میں ان کی شخصیت کی دلکشی اور خلوص اور ان کے کردار و سیرت کی عظمت زیادہ اُجاگر ہوتی گئی۔ حج پر جانے سے پہلے مرحوم کی گفتگو بیشتر ادبی ہوا کرتی تھی لیکن حج سے واپس آنے کے بعد مذہب اور تصوف کی باتیں زیادہ ہو گئیں مرحوم میں ایمان اور اعتقاد کی پختگی کے ساتھ ساتھ احساس مزاح کی موجودگی ایسی چیز تھی کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ کسی پُر اسرار طریق پر مسرت کا خزانہ ان تک پہنچ رہا ہے۔ وہ نہایت مسرور چہرے کے ساتھ ملنے والوں کا استقبال کرتے تھے۔ مسرت سے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے آنِ واحد میں ملاقاتی کا احاطہ کر کے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتے تھے۔ اور جب گفتگو کرتے تھے۔ تو اس میں شگفتگی کے ساتھ ساتھ خلوص و محبت، ہمدردی و ہمدلی کے جذبات صاف چھلکتے محسوس ہوتے تھے۔ جس کے نتیجے میں یوں لگتا تھا جیسے کیف و مسرت کی ایک برقی رو رگ رگ میں دوڑ گئی۔ مرحوم نہایت سیح القلب

اور کشادہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ دوسروں کے خیالات اور نظریات کو بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنتے تھے۔ اور ان میں صداقت وحقیقت کے عنصر کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی لیے وہ بحث مباحثہ شاذ ہی کرتے تھے۔ اگر دوسروں کے نقطۂ نظر کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی کرتے تو اس تحمل اور ملائمت کے ساتھ کہ الجھنے کی کیفیت نہ پیدا ہو۔ مرحوم کی یہ بڑی خوبی تھی۔ کہ وہ اپنے ملنے والوں اور اپنے احباب کو کتاب سمجھکر ان کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے تھے۔ کہ کسی جزو کو رد اور کسی کو قبول کریں۔ بلکہ جیسے بھی وہ تھے۔ اسی طرح تمام وکمال انھیں قبول کر لیتے تھے۔ ان کی انسان دوستی کا جذبہ ایسا تھا۔ کہ کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کے نزدیک حجِ اکبر تھا۔ اور کسی کا دل توڑنا گناہِ کبیرہ۔ وہ تنگ نظری اور تعصب سے کوسوں دور تھے۔ صلح کل واقع ہوئے تھے۔ ہر مشرب کے لوگوں سے اُسی اخلاص ومحبت سے ملتے تھے۔

مرحوم بڑے نفیس مزاج، بامذاق، خوش دل، خوش گفتار اور خوش وضع واقع ہوئے تھے۔ سماع کا ذوق رکھتے تھے۔ اور شعری وادبی مذاق نہایت عمدہ تھا۔ ان کے پسندیدہ شعراء، خیام، حافظ اور اقبال تھے۔ ان تینوں شعراء کے بیشمار شعر انھیں ازبر تھے۔ جو دوران گفتگو وہ موقع محل کے لحاظ سے بے تکلف پڑھ دیا کرتے تھے۔ مذہبی ومتصوفانہ رجحان کے باوجود ان کی زندہ دلی، بذلہ سنجی اور ہمہ وقت رجائیت میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ سنجیدہ اور علمی گفتگو کے دوران میں بھی پُرلطف فقرے کہہ کر محفل کو ہنسا دیتے تھے۔

ان کی مادری زبان فارسی تھی لیکن فارسی کے علاوہ وہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کی شاعری پر ان کے پسندیدہ شعراء خیام، حافظ اور اقبال کی شاعری کا اثر صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ رباعی اور غزل ان کی محبوب اصناف تھیں۔ خمریات کے علاوہ ان کا موضوع عشق حقیقی اور حُبِ رسولؐ تھا۔ انھوں نے یہ رباعی جس کیفیت کے ساتھ ایک دفعہ سنائی تھی۔ وہ آج تک ذہن میں تازہ ہے۔

۵

ہے تشنہ مری روح بلالی ساقی ۔۔۔ مینائے غزل ہوگئی خالی ساقی
اے تشنگیٔ شوق بجھانے والے ۔۔۔ اے کوثر و تسنیم کے والی ساقی

اس رباعی میں تو "کوثر و تسنیم کے والی" کہہ کر وضاحت ہی کردی ہے۔ کہ خطاب کس سے ہے لیکن انہوں نے اور بہت سی رباعیاں ایسی کہی ہیں۔ جو خود انہی کے قول کے مطابق "ساغر و مینا کے پردے میں دل کی واردات" بیان کرتی ہیں۔ مثلاً اپنے عالمِ جذب و مستی کو ایک دفعہ اس طرح ادا کیا تھا ؎

بت خانے سے ہے آج حرم تک مستی ۔۔۔ میخانے میں ہے جام سے جم تک مستی
کیا سلسلۂ کیف ہے اللہ اللہ ۔۔۔ یوں دست بدست آئی ہے ہم تک مستی

ایک اور رباعی بھی انہوں نے بڑے مزے لے لے کر سنائی تھی ؎

ساقی کو ہے سجدہ کبھی ساغر کو سلام ۔۔۔ مستوں کی نمازیں نہ قعود اور قیام
میخانے کی چوکھٹ پہ نمازِ مستی ۔۔۔ حق حق میں صراحی ہے تو ہو ہو میں ہے جام

اور پھر یہ کہا کہ صوبۂ سرحد میں مجھ سے پہلے کوئی رباعی گو نہیں تھا، میں نے ہی اس حکیمانہ و عارفانہ صنفِ سخن کو یہاں رواج دیا۔ حق ہے کہ رباعی گو کی حیثیت سے مرحوم ضیاء صاحب کا مقام بہت اونچا ہے۔

غزل میں بھی مرحوم کی طبیعت کے فطری کیف، روحانی و ذہنی سکون اور جذباتی و نفسی آسودگی کا رنگ ایک عجیب ناقابلِ بیان نشاطیہ اثر پیدا کردیتا ہے۔ کوئی ساڑھے چھ سال ہوئے ہوں گے۔ کہ انہوں نے اپنی ایک غزل سنائی تھی۔ جو مری میں لکھی گئی تھی۔ اس کے دو شعر مجھے ابھی تک یاد ہیں:۔

ہمہ شب با قدح و جام غزل می گویم ۔۔۔ پیشِ آں ساقیٔ گلفام غزل می گویم
من کہ بے بادہ و بے جام غزل می گویم ۔۔۔ ہمہ از گردشِ ایام غزل می گویم

خمریات کے علاوہ چراغ اور روشنی و نور کے تلازمات ضیا جعفری مرحوم کو بہت مرغوب تھے۔ اور وہ اکثر اپنے جذبات و تاثرات کو اسی امیجری کی مدد سے ادا کرتے تھے مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

کبھی جو پی کے مرے ساتھ وہ نکلتا ہے
نشے میں میکدہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے

کوئی نگاہِ سرِ راہ منتظر ہے ابھی
کوئی چراغ سرِ رہگزار جلتا ہے

وہ آ گئے تھے وہ جا بھی چکے زمانہ ہوا
ابھی تلک سرِ مژگاں چراغ جلتا ہے

افق افق پہ تقاضائے نو بنو کی نوید
سحر قریب ہے سورج کہیں نکلتا ہے

چلو کر چند قدم اور روشنی کر لیں
دیے خموش سہی دل کا داغ جلتا ہے

خمریاتی اصطلاحوں میں اپنے واردات وجذبات کو بیان کرنا غزل کی روایات میں داخل ہے۔ لیکن اس روایت کو ضیاء صاحب نے جس خوبی سے نبھایا ہے، اس کی داد نہ دینا انصاف سے بعید ہوگا۔ ضیاء صاحب کی شاعری میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ بھی دلکش ہوتا ہے۔ اور اُن کی موسیقیت بھی۔ وہ غیر مانوس الفاظ اور تراکیب کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ان کی شاعری بنیادی طور پر داخلی شاعری ہے۔ قنوطیت، آنسو، آہیں، شر و فساد، دکھ درد، بیماری وغیرہ کے تأثرات و تصورات اُن کی شاعری میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیونکہ انہیں طمانیت قلب کی دولت میسر ہے جس کی وجہ سے ایک طرح کی مستی، سرشاری، سرور و کیف کا عالم اُن کے ذہن و قلب پر طاری رہتا ہے۔ اور یہی کچھ ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے ؎

وہ چھیڑی ضیاءؔ نے غزل سازِ دل پر
وہ پھوٹے لبِ زندگی سے ترانے

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ضیاء جعفری کی شخصیت اور فن کا فیضان باقی رہے گا

اس مادیت اور سائنس کے زمانے میں حضرت ضیاء جعفری جیسی شخصیتوں کا وجود بڑا غنیمت ہے۔ اور ان ہی شخصیتوں کے طفیل یہ معاشرہ قائم و دائم ہے۔ ایسی شخصیتوں کا اٹھ جانا۔ دوستوں۔ عزیزوں اور عقیدت مندوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ ان شخصیتوں سے لوگ فیضان اور فکر و نظر کے لیے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص اور بزرگ ہم سے رخصت ہوتا ہے۔ تو مجھے خیال آتا ہے۔ کہ اب ایسا بزرگ یا شخصیت ہمیں میسر نہیں آسکتی۔ کیونکہ ان کے ساتھ ایک پورے دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور جو نیا معاشرہ جنم لے رہا ہے۔ وہ ان جیسی شخصیتوں کے پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ وہ معاشرہ ہی تقریباً ختم ہو رہا ہے۔ جس میں حضرت سید ضیاء جعفری جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہماری معاشرتی اور ادبی زندگی کے علمبردار ہیں لیکن اب ہر طرف ایک تاریکی نظر آ رہی ہے۔

جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے ان کی اچھی باتوں کو کوئی بھی بڑا نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے پاس زندگی کی ارفع قدریں نہیں ہیں۔ یا یہ نسل ان قدروں کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ یہ حالات پرانی وضع کی شخصیتوں کی عظمت بڑھاتے رہیں گے۔ اور ہم انہیں کبھی فراموش نہیں کر پائیں گے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ جس سے مفر نہیں ہے۔ انسان اس دنیائے فانی سے چلا جاتا ہے لیکن اس کی شخصیت اور فن کا فیضان باقی رہ جاتا ہے۔ حضرت ضیاء جعفری اردو اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے کلام کو مرتب کرنا چاہیئے۔ صرف تقریبات منعقد کر کے ہم نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہم نے ضیاء جعفری مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کر دیا۔

اور بس۔ بلکہ ان کے عمل اور کلام کو عام کرنا چاہیئے۔

میں نے یورپ میں دیکھا۔ کہ وہ اپنی عظیم شخصیتوں کے حالات جمع کر کے انہیں کتابی شکل دیتے ہیں۔ پھر انہیں بڑی آب و تاب سے چھاپتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ کیسے کیسے لوگ ہم سے بچھڑ گئے۔ ہم نے ان کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کے بیشتر پہلوؤں کو بہت کم محسوس کیا۔ نتیجۃً نئی نسل اُن کے کارناموں سے محروم رہ گئی۔ حضرت ضیا جعفری کی سوانح عمری مرتب کی جائے۔ جس میں ان کی زندگی کے حالات تفصیل سے پیش کئے جائیں۔ اور ان کے فن کے ہر گوشے کو اجاگر کیا جائے۔ یہ معمولی کام نہیں ہے۔ اسے جامع منصوبہ بندی کے تحت کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر مرتضیٰ جعفری موجود ہیں وہ منصوبہ ترتیب دیں۔ اور مرحوم کے احباب ان کا ہاتھ بٹائیں۔

جناب عبدالودود قمر

سیّد ضیاء جعفری مرحوم سے میری وابستگی

سید ضیاء جعفری مرحوم سے میری وابستگی کی ابتداء ۱۹۲۶ء کے شروع میں ہوئی جب کہ میں اسلامیہ کالج پشاور میں ایف۔اے (سائنس میڈیکل) کا طالب علم تھا۔ ان دنوں میں سینما کا رسیا تھا۔ لہٰذا اگر ہفتے میں دو بار نہیں تو کم از کم ایک بار ضرور اس شوق کی تکمیل کے لیے اپنی سائیکل پر اسلامیہ کالج پشاور سے شام ڈھلے شہر پہنچ جاتا۔ اور پھر سینما دیکھنے کے بعد رات اپنے گھر واقع محلہ۔ "شاہ ولی قتال" میں گذار کر پو پھٹتے ہی واپس اسلامیہ کالج کی راہ لیتا۔

اس سلسلے میں ایک شام امپیریل سینما۔ بیرون کابلی دروازہ پشاور شہر میں (جواب ناولٹی سینما کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن کابلی دروازہ کا نام ونشان تک بھی مٹا دیا گیا ہے۔ بلکہ محلِ وقوع بھی محلِ نظر ہے) ایک شو دیکھنے کے لیے گیا۔ تو وہاں پر (سکینڈ کلاس میں) ضیاء صاحب کو اپنے ایک محب الٰہی بخش کے ہمراہ موجود پایا۔ میں ان سے علٰیحدہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لیکن ضیاء صاحب کی شرابی آنکھوں اور پُرکشش شخصیت نے مجھے اتنا مسحور کیا۔ کہ مجھے تماشا دیکھنا بھول گیا۔ اور میں ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ ہم نے باوجود تھوڑی دوری کے ایکدوسرے کا ہاتھ چھونے کی کوشش کی۔ اور کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ اس دوران ضیاء صاحب میری روحی ٹوپی جو ساتھ ہی خالی بنیچ پر پڑی تھی۔ اپنے سر پر رکھ لی۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنی جگہ پر رکھ دی۔ اس طرح گویا انہوں نے مجھے اپنے میں کلی طور جذب کر لیا۔ اس دوران ان کے ساتھی کو بالکل پتہ نہیں لگا۔ کہ ہم دونوں میں کیا نامہ وپیام ہو رہا ہے۔ شو کے ختم ہونے پر ہم علٰیحدہ علٰیحدہ چلنے لگے۔ اور ہم میں سے کسی کی ہمت نہ بندھی کہ دوسرے کو مخاطب کر سکے۔ یہاں تک کہ ہماری گلی آ گئی جس کے باہر اب بھی لاہوری حلوائی کی دکان موجود ہے۔ جہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد میں نے ناقابلِ بیان

اضطراب کی حالت میں گھر کی راہ لی۔ اور ضیآء صاحب اپنے ساتھی کے ہمراہ آگے قصہ خوانی کی طرف بڑھ گئے۔ یہ رات مجھ پر بڑی پریشانی میں گذری۔ کہ اب دوبارہ ضیآء صاحب سے کب، کہاں، اور کیسے ملاقات ہو۔ اور یہی حالت ضیآء صاحب کی بھی ہوئی لیکن ان دنوں وہ ازحد مجاہدہ اور قلبی ذکروفکر کا مرجع تھے۔ اور شاید انہیں اس قدر تکلیف برداشت نہ کرنی پڑی جتنی کہ مجھے اٹھانی پڑی۔ مختصراً یہ کہ ہم دونوں کی جلدی ملاقات ہو گئی۔ اور کیوں نہ ہوتی جب کہ تمثیلاً: دو ندیاں ایک ہی رُخ پر زور اور شور سے آگے بڑھ رہی ہوں۔ تو ان کا جلد مل جانا بعید از قیاس نہیں۔

ضیآء صاحب ان دنوں اپنے گاؤں ترناب (نزدِ ترناب فارم) میں مقیم تھے۔ اور صرف نمازِ جمعہ کے لیے پشاور شہر آیا کرتے تھے۔ اور نماز آپ مسجد قاسم علی خان میں، جو ہمارے مکان کے ملحق ہے۔ اور جہاں مولانا عبدالحکیم مرحوم خطیب تھے۔ ادا کیا کرتے تھے۔ لہٰذا نمازِ جمعہ میں ہم اکٹھے ہو جاتے تھے۔ اور نماز سے فارغ ہونے پر ہمارا تمام وقت گھومنے یا کسی باغ یا چمن کی گل گشت میں گذرتا۔ یہاں تک کہ رات بھی نصف سے آگے بڑھ جاتی لیکن ہمارا جی ایکدوسرے سے جدا ہونے کو گوارا نہ کرتا۔ تاہم بہ امر مجبوری اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے۔ یہ ایک ہفتے کی جدائی مہینوں کی جدائی سے کم نہ ہوتی۔ اور زندگی اس اُمید پر گذر جاتی۔ کہ آئندہ جمعہ کو پھر یکجائی اور تنہائی نصیب ہوگی۔

یہ یاد رہے، کہ جن دنوں کی یہ بات ہے۔ اور یہ آج سے تقریباً چوالیس سال قبل کا زمانہ ہے۔ اس وقت ضیآء جعفری ایک خوبصورت اور طرحدار جوانی کا پیکر تھے۔ اس کے ساتھ شربتی آنکھیں، جن پر مجھے بھی پہلی دفعہ شرابی ہونے کا گمان ہُوا لیکن جو فی الحقیقت روحانی کیف و سرمستی کا مظہر تھیں۔ اپنے اندر ایسی ناقابلِ بیان کشش لئے ہوئے تھیں کہ جو کوئی انہیں دیکھ پاتا۔ بے اختیار ان کی طرف کھچا چلا آتا۔ پھر میری کیا بساط تھی۔ کہ میں ان سے دور رہ سکتا۔ درآنحالیکہ مجھے بھی ان سے بے انتہا محبت ہو چلی تھی۔ بقول کسے ؏

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔

انہیں دنوں میں ضیآء صاحب کے مرشد حضرت سائیں رحمت اللہ صاحب

قادری، پشاور تشریف لائے۔ اس پر ضیاء صاحب نے مجھ سے کہا۔ کہ ان کے مرشد کی موجودگی میں وہ اپنا زیادہ وقت ان ہی کی خدمت میں گذاریں گے۔ لہٰذا مجھے زیادہ وقت نہ دے سکینگے۔
میں نے ان سے عرض کی۔ کہ مجھے بھی اپنے مرشد کے پاس لے چلیں۔ جس پر انہوں نے سکوت اختیار کیا۔ اور اس سکوت کی وجہ بعد میں سمجھ میں آئی۔ جو بقولِ ضیاء صاحب یہ تھی۔ کہ بندہ ان دنوں عقیدتاً اہلِ حدیث واقع ہوا تھا۔ جو پیروں۔ فقیروں۔ مزارات وغیرہ کے منکر ہیں۔ لہٰذا ضیاء صاحب نے بقول ان کے خیال کیا۔ کہ اگر ان کے مرشد سے ملاقات کے بعد میں نے ان کے مرشد کے بارے میں کوئی نازیبا الفاظ کہے۔ تو دوستی کا رشتہ جو نہایت محکم ہونے کے باوجود بھی تارِ عنکبوت کی مانند ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ تو مجھے ان کی دوستی سے یا ان کو میری دوستی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ انہی مزید یہ خیال بھی گذرا۔ کہ اگر مجھے حضرت سائیں صاحب کی خدمت میں حاضری دینے سے روک دیا جائے۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ جو نعمت مجھے بھی وہاں سے مل سکتی ہے۔ میں اس سے محروم رہ جاؤں۔ بہر حال میرے دل میں خود بھی یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ یہ الجھن ختم کردوں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بلکہ پہلی ہی ملاقات میں حضرت سائیں صاحب رحمۃ اللہ علیہ قادری کی سادگی اور دینداری سے اتنا متاثر ہوا۔ کہ دوسری دفعہ کی ملاقات میں ان سے بیعت کی درخواست کردی۔ کہ مجھے بیعت کرلیں۔ چنانچہ مجھے سلسلہ عالیہ قادریہ فاضلیہ میں بیعت کرلیا گیا۔ دوسرے جمعہ جب ضیاء صاحب حسبِ معمول گاؤں سے شہر تشریف لائے۔ تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہیں معلوم ہوا۔ کہ میں نہ صرف حضرت سائیں صاحب کی خدمت میں حاضری دے چکا ہوں۔ بلکہ ان کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف بھی حاصل کرچکا ہوں۔ اس طرح روحانی سلسلے میں بھی ضیاء صاحب کا پیر بھائی بن گیا۔ اور یہ رشتہ اٹوٹ ثابت ہوا۔ بلکہ روز بروز پائندہ تر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ضیاء صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔

اس سلسلہ میں ان کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ انہوں نے میری غیر حاضری میں حضرت سائیں صاحب کی خدمت اقدس میں اپنے اور میرے تعلقات کے بارے میں عرض کرتے ہوئے التماس کی تھی۔ کہ اپنی خاص توجہ سے جس طرح ضیاء صاحب کو اپنا لیا تھا۔ ویسے مجھے بھی اپنا لیں۔ چنانچہ یہی ایک

مردِ کامل کی خصوصی توجہ تھی۔ جس نے مجھے نادانستہ طور پر کھینچ کر ان کے قدموں میں لے ڈالا۔ اور یہ نعمتِ عظمیٰ مجھے ضیاؔء صاحب کے واسطے سے حاصل ہوئی۔ اور اس طرح ضیاء صاحب میرے راستے میں ہادی اور رہبر بھی ٹھہرے۔

ضیاؔء صاحب کے ساتھ میں جلدی ایسا گھل مل گیا۔ کہ ہم گویا ایک جان اور دو قالب تھے۔ اور ان کے گھر والوں میں خصوصاً ان کی والدہ محترمہ اور اہلیہ جنت مکانی نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اس طرح میں بھی اس جعفری خاندان کا گویا فرد بن گیا۔ میرا اکثر وقت کالج سے شہر آنے پر ضیاء صاحب کے گھر پر یا باہر ان کے ہمراہ گھومنے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھنے۔ یا باغ و راغ کی گل گشت میں صرف ہوتا تھا۔

سید عبدالستار بادشاہ جان

ضیاء صاحب نمازِ جمعہ پڑھنے جب شہر آتے تھے۔ تو اکثر جمعہ کے بعد سید عبدالستار شاہؒ المعروف بادشاہ جان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے۔ جب ان دنوں وہ ایک چائے کی دکان کی بیٹھک میں جو اس دکان کے عقب میں واقع تھی۔ قیام پذیر ہوا کرتے تھے۔ اور یہ دکان ڈبگری بازار پشاور میں واقع تھی۔ میں ان کے ہمراہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت بادشاہ جانؒ نہایت ملاطفت اور احترام سے ضیاء صاحب سے پیش آتے۔ یہاں تک کہ اگر ضیاء صاحب اپنی دستار جو ململ کی ہوا کرتی تھی۔ سر سے اُتار کر نیچے رکھنا چاہتے۔ تو بادشاہ جان قدس سرہٗ العزیز اسے اٹھا کر اپنی گود میں لیتے۔ یہ سلسلہ آمد و رفت یہاں تک بڑھتا چلا گیا۔ کہ بادشاہ جان صاحب اسی بازار کے دوسرے سمت (بجانبِ شمال) ایک بالاخانے پر منتقل ہوگئے جہاں ہر شام محفلِ سماع منعقد ہوتی۔ خصوصاً شبِ جمعہ کو زیادہ رونق ہوتی۔ جب کہ چائے کا دور بھی چلتا۔ ان محفلوں میں ہم اکثر حاضری دیتے رہے۔ اگر ہم دیر سے پہنچتے۔ اور محفل شروع ہوتی۔ تو ضیاء صاحب کے پہنچنے پر حضرت سید بادشاہ جانؒ صاحب کمال محبت سے احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ جس کی پیروی باقی اہلِ مجلس کو بھی کرنی پڑتی۔ اس کے بعد آپ ضیاء صاحب کے لیے اپنی بغل میں جگہ خالی کر دیتے۔ یا خود اپنی مسند سے ذرا ہٹ کر ضیاء صاحب کے لیے جگہ چھوڑ دیتے۔ اور

گاؤ تکیہ بھی اپنے دست مبارک سے ضیار صاحب کے لیے لگا دیتے۔ میں بھی ذرا ہٹ کر کہیں قریب ہی بیٹھ جاتا۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے۔ کہ حضرت بادشاہ جان ایک بڑے صاحب سلسلہ بزرگ اور چشتیہ نیازیہ سلسلہ کے سجادہ نشین تھے۔ جن کے مرید ہزاروں کی تعداد میں غیر منقسم ہندوستان اور سرحد میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے زیر اہتمام اسی بازار (ڈبگری) کی ایک سرائے میں ہر چھٹی شریف (قمری مہینہ کی ششم تاریخ) کو ایک مجلس سماع بڑی شان و شوکت سے منائی جاتی اور سال میں ایک دفعہ جشن تاجپوشی خواجہ غریب نواز" بڑی دھوم دھام سے کیا جاتا۔ جب کہ تمام در و دیوار رنگا رنگ کی روشنیوں سے بقعہ نور بن جاتے۔ دروازے بنائے جاتے۔ جھنڈیاں لگائی جاتیں۔ اور کئی جگہ قوالوں کی ٹولیاں سرگرم عمل نظر آتیں۔ ان خصوصی مجالس میں بھی حضرت ضیار صاحب کے ساتھ اس حقیر کو مہمانِ عزیز کی نظروں سے دیکھا جاتا۔ اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ یہ تھا حضرت بادشاہ جان کا خلقِ کریمانہ۔ اور یہ تعلق ان کے وصال تک قایم رہا۔

سید نور بادشاہ بخاری

ایک اور بزرگ جن کے ساتھ ضیار صاحب کا خصوصی روحانی رابطہ اور محبت تھی۔ وہ سید نور بادشاہ بخاری سجادہ نشین حضرت سید سلطان صدر الدین بھکری سہروردی تھے۔ جن کا مزار مبارک اٹک میں حضرت شیخ المشائخ محمد یحییٰ المعروف بہ حضرت جی صاحب اٹک (متوفی ۱۱۳۳ھ) کے مزار سے ذرا آگے پہاڑی پر سڑک کے داہنے طرف (سڑک سے بجانب جنوب) واقع ہے۔ سید سلطان صدر الدین سلطان سکندر لودھی کے ہمعصر اور سنہ ۹۰۰ھ کے زمانہ کے بزرگ ہو گذرے ہیں۔

جناب سید نور بادشاہ صاحب کا مکان اور حجرہ موضع "ملاحی ٹولہ" میں تھا۔ جو دریائے اٹک کے کنارے قلعہ اٹک کے متصل ایک بستی ہے۔ جو اغلباً اٹک کے قلعہ کے عدم سے وجود میں آنے کے بعد، جو اکبر اعظم کی یادگار ہے۔ منصۂ شہود پر آئی۔ یہ بزرگ (سید نور بادشاہ) جب کبھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ، جو قوالوں اور توپچیوں (چلم برداروں) اور مریدوں پر مشتمل ہوتی۔ پشاور شہر تشریف لاتے۔ تو بندہ ضیار صاحب

کی معیت میں ان کی خدمت عالی میں ضرور حاضری دیتا۔ وہ ضیاء صاحب کو میر صاحب کے نام سے خطاب کرتے۔ جو ان کا خاندانی لقب ہے۔ اس نام سے ان کے والد بزرگوار میر مرتضیٰ شاہ بھی پکارے جاتے تھے۔ جو اٹک میں تھانیدار رہ چکے تھے۔ اور ان کے سید نور بادشاہ صاحب کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ سید نور بادشاہ صاحب فرماتے تھے۔ کہ میں نے ضیاء صاحب کو گود میں کھلایا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ضیاء صاحب کی پیدائش بمقام جانلی (ضلع اٹک) ظہور پذیر ہوئی تھی۔

ضیاء صاحب کئی دفعہ اٹک بھی گئے۔ جہاں اٹک میں حضرت سرّ الاعظم شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ حضرت جی صاحب نقشبندی اور حضرت سلطان صدر الدین بھکری سہروردی کے مزارات مبارک پر حاضری دیتے۔ اور ساتھ ہی سید نور بادشاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع بھی میسر آتا۔ ان ملاقاتوں میں، میں اکثر ضیاء صاحب کے ہمراہ ہوتا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ جب کہ یہ چسکہ بھی ان کے طفیل مجھے پڑا۔ اور اب بھی اس کی لذت سے کام و دہن کی تشنگی باقی ہے۔ بقولِ حافظ شیرازی ؎

صباح الخیر زد بلبل کجائی ساقیا برخیز
کہ غوغا میکند در سر خمارِ خمرِ دوشینم

قاضی عبدالحلیم اثرؔ افغانی ۔

حضرت سیّدی ضیاؔ جعفری

حضرت سید آغا میر عنایت علی شاہ ضیاؔ جعفری ساداتِ کرام کے اس خاندان سے ہیں۔ جن کے بزرگ سرزمین عراق سے ایران اور افغانستان کے راستے پشاور پہنچے ہیں۔ اور ان کے انفاس قدسیہ سے یہ سرزمین منور رہی ہے۔ آپ کا شجرہ نسب یہ ہے۔

سید عنایت علی (شاہ۔ ضیاؔ جعفری) ابن سید مرتضیٰ شاہ ابن سید میر علی جان ابن سید میر احمد شاہ ابن میر گوہر علی شاہ ابن سید آغا میر طیب ابن آغا میر شرف علی شاہ ابن آغا میر جان ابن سید آغا میر گنج بخش المعروف بنفس سوختہ ابن سید آغا شیر علی شاہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہم ۔

روایت ہے کہ حضرت سیدی کے اجداد میں سے سید آغا شیر علی شاہ شیرازی ایران سے افغانستان تشریف لائے۔ اور مقام غزنی قیام کیا تھا۔ زمانہ کے اعتبار سے آپ شہنشاہ جہانگیر کے ہمعصر تھے۔ جہانگیر کے عہد میں مملکتِ ایران سے شیعہ علماء۔ مشائخ اور سادات جس کثرت سے آئے تھے۔ سید شیر علی شاہ کی آمد بھی اس سلسلہ میں شمار کی جاسکتی ہے۔ اور آپ کا مزار غزنی میں بتلایا جاتا ہے۔ یہاں ایک تاریخی نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کے مؤرخین جب غزنی کا نام لیتے ہیں۔ تو اس سے وہ مخصوص شہر مراد لیا جاتا ہے۔ جس کی بنیاد ۲۵۷ھ مطابق ۸۷۰ء میں یعقوب ابن لیث صفاری نے وادی "شیل گرا" کے شمال مغربی گوشہ میں رکھدیا تھا لیکن جہاں تک واقعات اور حقائق کا تعلق ہے۔ غزنی سے وہ علاقہ اور وادی مراد لینی چاہیئے۔ جو عظیم تر وادی [شیلا گرا] کے شمال مغربی حصہ میں واقع ہے۔ اور اس کا ایک قدیم ترین نام [ھجویرا] بھی ہے۔ اور درحقیقت یہی وادی (ہجویرا) ہے۔ جس کا ایک قدیم تاریخی نام [غزناؤ] اور [غزنادہ] جس کا ایک سرا جنوب مشرقی سمت میں

[لوئی ناؤ] سے مل جاتا ہے۔ اور اسی طرح [غزناؤ] کے سطح مرتفع پر شہر [غزناؤ] بنایا گیا ہے۔ [غز] ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جو کہ جنوبی عرب کے قحطانی قوم کی ایک ذیلی شاخ ہے۔ سلاطین خاندان غز اسی قوم سے ہو گذرے ہیں۔ اور ایک دوسرے اعتبار سے قدیم [ھج ویرا، اگ بیرا] اور [غزناؤ] کا ایک دوسرا قدیم تاریخی نام "شیلا گرا" ہے۔ اور آج وادی ہجویرا اور غزناؤ اسی شیلاگر [شیل گر] کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔

وادئ غزناؤ (غزنی) قوم غلزائے کے مقبوضہ علاقہ کا ایک حصہ ہے۔ اور یہاں خصوصیت کے ساتھ سادات کے خاندانوں میں سے وردگ اور ھنی سادات کے خاندان آباد ہیں جن کا شجرہ نسب اوپر جاکر سید ابراہیم الاصغر ابن امام موسیٰ کاظم ابن امام جعفر صادق سے جا ملتا ہے۔ ان کے علاوہ ابابکر زی خاندان کے سادات ہیں۔ جو مشہدی سادات کی خاندان ہے۔ اتوزی سادات ہیں۔ جو امام موسیٰ المبرقع ابن امام تقی ابن علی رضا ابن امام موسیٰ کاظم ابن امام جعفر صادق کی نسل سے ہیں۔ محمدی زی سادات ہیں۔ جو محمد ابن علی المختار ابن جعفر ثانی تواب زکی کی نسل سے ہیں۔ اور ان کے ساتھ سادات کا ایک دوسرا خاندان ہے۔ جسے "میران" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سادات کے ایک دوسرے خاندان کے لوگ نودی کہلاتے ہیں۔ حضرت سیدی ضیا جعفری کے جد امجد سید شیر علی شاہ شیرازی اسی وادئ غزناؤ (ہجویر، شیل گر) میں آکر وردگ سادات کے ذیلی شاخوں کے پاس اس وادی کے شمال مشرقی گوشہ میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ جگہ اپنی جغرافیائی طبعی لحاظ سے شہر کابل کے جنوب مشرق میں واقع وادی لہوگر کے قریب ہے۔

حضرت سید شیر علی شاہ شیرازی کے فرزند ارجمند "آغا میر" "گنج بخش" المعروف آغا میر "نفس سوختہ" شہر کابل تشریف لائے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کا اسم محضہ آغا میر تھا۔ وجہ یہ کہ ایک تو آپ کی اولاد میں آغا میر نام رکھنے کا دستور چلا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ متذکرہ بالا علاقہ کے انساب کے سلسلوں میں میری کے نام سے ایک سلسلہ نسب کا ذکر موجود ہے۔ جسے عرفِ عام میں میران کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے "آغا میر" کا تعلق اس میران خاندان سے ہو۔

"سید آغا میر" کے دو القاب ہیں۔ "گنج بخش" اور "نفسِ سوختہ" ان میں سے خصوصیت کے ساتھ ایک لقب "نفسِ سوختہ" یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ آپ "صاحبِ مجاہدہ" "مرتاض بزرگ، اور مجذوب سالک" تھے۔ اور غالباً سیدی ضیاء جعفری کے اجداد میں سے بھی وہ صاحبِ ولایت اور کرامت بزرگ ہیں۔ جن کی روحانیت کا پرتو بطورِ خاص حضرت ضیاء جعفری کی زندگی پر پڑ گیا تھا۔ غالباً آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ ایک "ولی اللہ" جو مجذوب بھی ہو، اور سالک بھی ہو۔ گیارہویں پشت تک اس کی نسل میں سے کسی نہ کسی فرزند، پوتے، پڑپوتے، کو اس کے جذب اور سلوک کے روحانی فیوضات بطورِ ورثہ کے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور حضرت سید ضیاء جعفری کے جاننے والوں کو معلوم ہوگا۔ کہ آپ بنیادی طور پر مجذوب تھے۔ سلوک اور طریقت کے راستہ پر بعد میں چل نکلے تھے۔ اور اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی۔ کہ آپ کے جدِ امجد میر گنج بخش بھی پہلے "نفسِ سوختہ" اور بعد میں "گنج بخش" بنا دیے گئے تھے انہیں جذبِ الٰہی نے سوختہ بنا دیا تھا۔ اور اسی نے سلوک کا راستہ دکھا کر "گنج بخشی" کے مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ اور ان ہی اثرات کے تحت حضرت سید ضیاء بھی پہلے "مجذوب" اور بعد میں "سالک" تھے۔ اس اعتبار سے آپ کا جذب موروثی اور اویسی تھا۔

جیسا کہ میں نے اپنی تالیف "روحانی رابطہ" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ درویشوں کا وہ طبقہ جو پیدائشی اُویسی ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی پیر کے طلب میں نہیں گھوما کرتے۔ بلکہ جن اولیاء اللہ کے پاس ان کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے پاس بھجوائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ برادر عزیز سید مبارک شاہ صاحب۔ لالہ عبدالودود قمر قادری اور خود سیدی ضیاء جعفری نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے۔ سب سے پہلے سید ضیاء کی ملاقات بھی ایک مجذوب سے کرائی گئی تھی۔ اس طرح سے کہ ان مجذوب صاحب کو ضیاء جعفری کے راستے میں لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ جنہوں نے سید ضیاءؔ کو اپنے بے پناہ جذب سے کاروباری زندگی سے نکال کر جذب و سرمستی کے راستہ پر لگا دیا تھا۔ اور بعد میں ایک دوسرے درویش جو سائیں صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور سلسلہ عالیہ قادریہ میں مجاز۔ ماذون اور صاحبِ تصرف سالک تھے۔ لیکن بنیادی طور مجذوب سالک تھے۔ انہوں نے حضرت سید ضیاء کو سلسلہ عالیہ فاضلیہ قادریہ

میں بیعت کرنے کے لیے خود پشاور شہر میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ اور آپ سید ضیاء کو جذب اور سلوک دونوں راستوں پر چلا رہے تھے۔ اور اس سے ہمارے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ جو لوگ موروثی اویسی ہوتے ہیں۔ وہ بڑے پیارے اور لاڈلے ہوتے ہیں۔ ان کو پیدائشی طور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی روح پرفتوح سے اویسؓ قرنی کی طرح نسبتِ خاص حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کے زمانہ کے مجذوبین اور سالکین اس پیارے نبیؐ کے لاڈلے کو اپنا اپنا حصہ دینے کے لیے خود چل کر پہنچاتے ہیں۔

بعد میں حضرت سائیں صاحب رحمۃ اللہ علیہ قادری نے جذب اور سلوک دونوں راستوں پر سید ضیاء جعفری کی تربیت فرما کر اپنے پیر طریقت حضرت سید نذر محی الدین قادری۔ فاضلی۔ بٹالوی کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔ جہاں آپ نے سیدی ضیاء کو خرقۂ خلافت سے نوازا۔ اور اس طرح آپ کی قادری نسبت شاہ نذر محی الدین کی وساطت سے قائم ہو گئی۔

حضرت سیدی ضیاء جعفری کے اجداد میں سے آپ کا سب سے پہلا جدِ امجد جو پشاور شہر تشریف لایا تھا۔ ان کا اسمِ گرامی سید آغا میر طیب تھا۔ آپ زمانہ کے لحاظ سے احمد شاہ ابدالی، تیمور شاہ اور اس کے تینوں فرزندوں زمان شاہ، محمود شاہ اور شاہ شجاع کے ہمعصر تھے۔ ۱۲۱۹ھ اور ۱۲۲۴ھ کے درمیانی زمانہ میں شہر کابل کے اندر جو ہمہ گیر شیعہ، سنی فسادات ہوئے تھے۔ آپ اسی کے دوران کابل سے ترکِ سکونت پر مجبور ہو کر پشاور تشریف لائے تھے۔ آپ کے احوال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سید آغا میر طیب مسلک کے لحاظ سے شیعہ اثنا عشری مسلک کے پیروکار تھے۔ فوت ہونے پر پشاور شہر کے مشہور شیعہ بزرگ سید کریم شاہ بخاری کے مزار کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔ یہ مزارات جی ٹی روڈ اور ریلوے اسٹیشن پشاور کے مال گودام کو جاتے ہوئے سڑک کی بیچ میں واقع ہیں۔ سید آغا میر طیب کے نسل کے سادات پشاور شہر اور قریبی مضافات میں آباد ہیں۔ اور شیعہ اثنا عشری مسلک کے پیروکار ہیں۔ اس خاندان میں صرف سید عنایت علی شاہ ضیاء جعفری ایک ایسے شخص تھے۔ جو سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت ہونے کے بعد اہل السنت والجماعۃ کے مسلک کے پیروکار بن

گئے تھے۔

سیدی ضیاء جعفری جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے عام زندگی کو چھوڑ کر طریقت اور معرفت اور فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر چکے تھے۔ سیدی ضیاء جعفری کا اس مسلک میں آکر روحانی مقام اور مرتبہ کیا تھا۔ مجذ و بیت میں ان کا شمار کس زمرہ میں سے تھا۔ اور سلوک کے منازل میں ان کا درجہ کیا تھا۔ اس کے متعلق آپ کے اپنے پیر بھائی، یاران طریقت اور دوسرے روحانی وابستگان ہی صحیح طور کچھ بتلا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس قسم کے باتوں کا اظہار اور بیان مناسب ہو۔ جہاں تک مجھ راقم الحروف عبدالحلیم اثر افغانی کا سوال ہے۔ مجھے ۱۹۳۳ء سے لیکر آپ کی وفات مئی ۱۹۷۰ء تک سینتیس ۳۷ سال کے طویل عرصہ کا نیاز حاصل رہا۔ میری نیاز مندی تھی۔ اور آپ کی کرم گستری۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ کرم گستری خاندان سادات کی صفات میں سے ایک لازمی صفت ہے۔ البتہ اس لازمی صفت سے موصوف نے مجھے خاص طور نوازا تھا۔ میرے ایک پشتو غزل کا ایک مصرعہ ہے۔ دغہ زۂ یم چہ خہ وینم ھغہ وائم۔ (ترجمہ) یہ میں ہی ہوں کہ جو کچھ دیکھتا ہوں وہی کہتا ہوں۔" فقر اور درویشی کے منازل میں اپنے مشاہدات کا بیان کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے خاص طور سے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی زندہ فقیر۔ درویش اور ولی اللہ کے باطنی احوال اور مراتب کا پردہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اب جب کہ سیدی ضیاء فوت ہو چکے ہیں، ان کے باطنی احوال کے بیان کرنے میں مجھے کچھ مشکل پیش نہیں آرہی۔ میں نے اس سینتیس ۳۷ سالہ دورِ رفاقت میں آغا ضیاء کے "روحانی دنیا" کے بہت سے گوشے دیکھے ہیں۔ لیکن بعض واجب الاحترام احباب خصوصاً جناب لالہ عبدالودود قمر قادری (فاضلی) کا ارشاد ہے۔ کہ مجھے اس قسم کے رازوں سے پردہ نہیں ہٹانا چاہیئے۔ تاہم اتنا کہنے کی اجازت چاہنے میں باک نہیں ہوگا۔ کہ حضرت سید ضیاء جعفری مرحوم صاحبِ کشف و کرامت ولی اللہ اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کو کشف القبور اور کشف الصدور کا مقام حاصل تھا۔ اور بطورِ خاص آپ کو دو نسبتیں اور ان کے فیوضات حاصل تھے۔

(الف) ایک حضرت غوث الاعظم میران محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی کی نسبت اور اس نسبت خاص کی وجہ سے آپ میں دستگیری کے وصف کا پیدا ہونا۔

(ب) دوئم۔ حضرت خواجہ معین الحق والملۃ والدین شیخ حسن سنجری، اجمیری، چشتی کی نسبت اور اس نسبت کی بدولت آپ میں غریب نوازی کی تعریف۔

یہ دونوں صفاتِ عالیہ دستگیری اور غریب نوازی آپ میں موجود تھیں۔ اور آپ کی نگاہ میں محبوبیت تھی لیکن اپنے احوال کو چھپائے رکھتے تھے۔ ادب اور شعر کا پردہ اپنے اوپر اوڑھ رکھا تھا۔ مجھے افسوس ہے۔ کہ میں اس سے زیادہ باوجود جاننے کے بھی بیان نہیں کر سکتا۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ اس مقام پر آکر ایک سالک کو جن اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا پڑتا ہے۔ ان اچھے اخلاق سے حضرت ضیاء جعفری بھی موصوف تھے۔ آپ اہل طریقت کی اصطلاح میں فقر اور درویشی کے جس بلند تر مقام پر فائز تھے۔ اسے میں کیا بیان کروں۔ اور آپ جان کر کیا کریں گے۔ آپ کو اس کے نتائج ذہن نشین کر لینا چاہئیں۔ جن کی طرف ذیل میں اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ آپ کے دل کو محبت کی زندگی ملی تھی۔ جس کے نتیجہ میں آپ کا مزار پُرانوار زندہ رہے گا۔ اور آپ کی یہ "زندہ قبر" مرجع عام وخاص ہوگا۔ اس سلسلہ میں حافظ اور رحمان بابا کے دو شعر پڑھنے کے ہیں۔

(الف) ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(ب) همېره خلق ئې زيارت کا پس مرګه چه بانړ دوی په مزار د درويشانو

(۲) اور دوسرا نتیجہ یہ کہ آپ کے فقر کی دولت آپ کی اولاد میں باقی رہے گی۔ اور آپ کی روح ان کی سرپرستی کرتی رہے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

حضرت سید ضیاء جعفری کی اولاد (لڑکوں اور لڑکیوں) کے لیے درگاہِ خداوندی میں میری کچھ التجائیں ہیں۔ آپ بھی دعا فرمائیں۔ کہ آپ کی یہ نسل باقی رہے۔ اور باقیات صالحات کے زمرہ میں سے شمار ہو کر اس کا سلسلہ بڑھے۔ بھلے اور پھولے۔ تاکہ اپنے باشرف بزرگوں کی یاد تازہ رکھ سکیں۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ اسے میری خوش نصیبی کہیئے۔ کہ آپ وفات

کے وقت مجھ سے راضی تھے۔ اور اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مجھے اپنی نیک دعاؤں سے سرفراز فرما کر پیار کیا۔ اور مجھے یقین ہے۔ کہ وہ آپ سب سے بھی راضی تھے۔ وجہ یہ کہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے۔ خاندان سادات کی تعریفوں میں سے ایک یہ ہے۔ کہ وہ اپنے جد امجد کی رحمۃ اللعالمینی کے وصف کے صدقے کسی سے ناراض ہونا جانتے ہی نہیں ہیں۔ قدرتی بات ہے۔ کہ ایسے پیارے۔ محسن اور مشفق دوست اور مربی مجھے اور آپ کو یاد آتے رہیں گے۔ اور ہمارے دلوں سے ان کے لیے پُرخلوص دعائیں نکلتی رہیں گی۔ علیہ الرحمۃ و الغفران۔

جناب رضا ہمدانی

میرا ضیاء

ہر فرد بشر کے لیے ——

موت ناگزیر ہے۔ موت کے ٹوکلوں نے دانشوروں کو تاک لیا ہے۔ یاران میخانہ ایک ایک کرکے اُٹھ رہے ہیں۔ ادھر عشرت ملک گئے۔ مرزا محمود روٹھ گئے۔ کوکب تبریزی گوشہ نشین ہوگئے۔ اُدھر شکیل بدایونی چھن گئے۔ قمر جلالوی مرحوم ہوگئے۔ مخدوم محی الدین بھی چل بسے۔ امتیاز علی تاج کے قتل سے ادب کا تاج محل مسمار ہوگیا۔ کس کس کو یاد کیا جائے۔ کس کس کی یاد کی کرچیں خونچکاں دل کے آئینہ خانے میں سجائی جائیں۔

اور آج ہم سوگوار اپنے ضیاء کی مجلسِ عزا میں بیٹھے دستِ غم سروں پر مار رہے ہیں۔ ضیاء میرا ضیاء۔ فارغ کا ضیاء، فراز کا ضیاء۔ برلاس کا ضیاء، خاطر کا ضیاء، محسن کا ضیاء، عبدالودود قمر کا ضیاء، اپنے کا ضیاء اور پرائے کا ضیاء۔

ضیاء، جس کے دم سے احباب کی محفل ہمیشہ منور رہی۔ ضیاء کے ساتھ ہم سب کا رشتہ وہ نہیں تھا۔ جو اختر جعفری کا یا حیات جعفری کا ہے۔ ہمارا اس کے ساتھ وہ تعلق بھی نہیں تھا۔ جس کا منظاہرہ اس کے مریدان باصفا کرتے ہیں۔ ہم سب کا تعلق ضیاء کے ساتھ بے لاگ، بے غرض، اور مفاد مادی وروحانی سے بے نیاز ایک دوست کا تھا۔ محض دوست، وہ جب بھی ہم سے ملا۔ جیسے ہم سب نے اپنی کوئی قیمتی کھوئی چیز پائی۔ وہ جب بھی اپنے یارانِ قدیم کے جلسے میں بیٹھا۔ اپنے تمام خول اتار کر بیٹھا۔ اور جب رخصت ہوا۔ تو خونوں کی گھڑی یہ کہتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا۔

بہر کارے کہ باشی باخدا باش

ضیاء کی کس کس ادا کی بات کی جائے۔ کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ اس کی ذات اس کے عقیدے کی طرح "ہمہ اوست" تھی۔ وہ انسان کا پرستار تھا۔ اپنے عقیدے کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے وہ ہمیشہ یہی کہتا۔ کہ تصوف نسل و رنگ اور مذہب وملت کے تعصب کی دیواروں

گوگرا کر ایک بے کراں سرسبز و شاداب اور پُرسکون وادی میں لے جاتا ہے۔ جہاں پھول اور کانٹے، ہرن اور شیر مل جل کر رہتے ہیں۔

ایک صوفی مشرب کے نزدیک تمام انسان خدا کی ذات کا پرتو جمیل ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ کسی مذہب کے معتقد کو غیر نہیں سمجھتے تھے۔ آفاق میں جہاں کہیں بھی انسان کو دکھ پہنچا ضیاؔ نے اس کی پھانس کی چبھن محسوس کی۔ مولوی رومی رح کا مصرعہ ہر آن اُن کی زبان پر رہتا ع

کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

جب یہ متاعِ عزیز ہم سے چھن رہی تھی۔ تو میں سوگوارِ ضیاؔ بھی ضیاؔ کے سرہانے موجود تھا۔ وہ نیم بستہ آنکھوں سے آسمان کی طرف نگران تھے۔ تنفس کی برق رفتاری ان کی منزلِ عمر کو قطع کرنے میں فیاضی سے کام لے رہی تھی۔ میرے ذہن میں معًا ان ہی کا شعر گونجنے لگا۔ ؎

نادم طبیب موت قریب آشنا بعید
حسرت سے آسماں کی طرف دیکھتا ہوں میں

اُس وقت واقعی وہ اپنے شعر کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ طبیب واقعی اپنی جد وجہد کو ناکام ہوتا دیکھ کر نادم تھے۔ موت قریب تھی۔ آشنا اگرچہ ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے مگر چونکہ وہ بھی بے بس تھے۔ لہٰذا ان سے بہت دور تھے۔ اور ان تمام مایوسیوں کی موجودگی میں وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے آسمان کی طرف نگران تھے۔ اور جس نے ان کو عارضی زندگی عطا کی تھی۔ اپنی زبانِ بے زبانی سے وہ شاید یہ کہہ رہے تھے۔ کہ بس! اتنا جلدی پشیمان ہوگئے کوئی بات نہیں۔ یہ لو اپنی زندگی۔

عطائے شما بلقائے شما۔

مانگے تانگے کی زندگی ہمارے طائر لاہوتی کو پسند نہ آئی۔ اس نے زندگی دینے والے کے احسان کا بدلہ اپنی جان دے کر چکا دیا۔ آج ضیاؔ ہم میں نہیں ہے۔ وہ جو ہماری ہر مجلس کا رکنِ اعظم تھا۔ جس کے بغیر ہماری کوئی مجلس مکمل نہیں تھی۔ جو پچاس سال مسلسل و متواتر کوچہ رسالدار میں بجھنے والی بزمِ سخن کا چراغ رہا۔ دائرہ ادبیہ میں قندیل کی طرح روشن رہا۔

انجمن ترقی اردو میں شمع انجمن کی طرح گردش کرتا رہا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اور ادبستان میں سر حلقہ بزمِ یاراں رہا۔ یہ بڑی ہولناک بات ہے۔ کہ حال کی یہ بزم اسی ضیاء سے خالی ہے۔ جو ماضی میں ہماری ہر محفل کا نور تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا مستقبل اسی کی یاد سے روشن رہے گا۔

دوستو، ضیاء، ہم سب کا دوست تھا۔ وہ ان کا بھی دوست تھا۔ جو اسے دوست نہیں سمجھتے تھے، لیکن ہم ایک دوسرے کو اپنا دوست کہتے ہوئے بھی، شاید ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ ضیاء کی موت ہمیں یہ سبق دے رہی ہے۔ ؎

نفس کی آمد وشد کا کچھ اعتبار نہیں
جو تیری یاد میں گذرے وہ دم غنیمت ہے

پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے شاعر دوستو۔ آؤ کہ ہم سب اپنے آپ کو رشتۂ محبت والفت میں استوار کر کے ایکدوسرے کے گلے کا ہار بن جائیں۔ ہم اگر ٹوٹی ہوئی باہیں بھی ہیں۔ تو کیوں نہ اپنی ہی گردنوں میں جھول جائیں۔

خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نہ ماند

جناب سید مظہر گیلانی

ضیاء جعفری

ضیار بہ موجۂ مضراب حسن گم شدہ ایم
نوائے ماست کہ از تار تار می خیزد

ضیار کائنات و ماورائے کائنات کے حسن و جمال اور کیف و سرمستی کے تلاطم وطوفان میں کچھ ایسے حسین و دلکش انداز میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کہ انہیں پوری زندگی ایک دلربا نغمہ جان بخش کی شکل میں اٹھلاتی اور رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

خوبصورت زندگی اور دلفریب کائنات کو منسلک کرنے والی نرم و گداز تاروں میں خوابیدہ نغموں کو زندہ و بیدار کرنے کے لیے جب مضرابِ حسن مصروفِ کار ہوتا ہے۔ تو ضیار جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔ اور اسی عالمِ کیف و مستی میں سمجھتے ہیں۔ کہ خوبصورت کائنات کی حسین فضاؤں کے دوش پر تیرنے والے سرور انگیز نغمے شاید ان ہی کے رگ و پے کے مسلسل تناؤ اور خمیازوں سے جنم لے رہے ہیں۔ اور وہی ہیں جو ماحول کی جھولی کیف و سرور سے بھر رہے ہیں۔ وہی ہیں، جن کے حسن و جمال کی شعاعیں مصحفِ گیتی کو منور کئے ہوئے ہیں۔ اور ان ہی کی جلوہ ارزانیاں ہیں۔ جو کائنات کو روشنی اور درخشندگی عطا کر رہی ہیں۔ اور وہی ہیں۔ جن کی ہر ادا۔ ہر لمحہ کائنات کو ایک نیا تاثر بخش رہی ہے۔ چنانچہ وہ والہانہ انداز میں پکار اٹھتے ہیں۔

وہ حسن ہوں کہ سر سے قدم تک ادا ہوں میں

یہیں پر ضیار کا جذبہ تحیّر و استعجاب یک لخت بیدار ہوتا ہے۔ وہ ہر دلفریب اور خوش جمال منظر کے بعد دوسرے حسین منظر کے ترتیب پانے پر حیران و ششدر رہجاتے ہیں۔ سابقہ دل پذیر و دلکش مناظر کی جمال ارزانیوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور نئے منظر حیات کی دلاویزی و دلربائی کو ایک متنوع اور عجیب چیز سمجھ کر پکار اٹھتے ہیں۔

جام ایسا شراب ایسی۔ حسن ایسا شباب ایسا
ہم نے تو نہ دیکھا تھا۔ ساقی کبھی خواب ایسا

اس لیے کہ موجۂ مضراب حسن کی پہنائیوں میں گُم ہو جانے کے بعد وہ ساغر ماحول میں شراب خوری کی موج محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر تختۂ گل پر بادِ صرصر کے خوشگوار تھپیڑ دل سے ہلکورے کھاتے ہوئے پھولوں کی موج بھی۔ اُن پر کیف و سرور کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ عقل و شعور۔ رسم و رواج اور تکلفات کی حدود پھاند کر بے خودی کی سکوت بخش موج سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمہ نور و جمال۔ ہمہ کیف و مستی ہمہ رامش و رنگ بن کر اپنے آپ کو ایسا ملاح تصور کرنے لگتے ہیں۔ جو زورق بہار کے چپو تھامے رنگ و بو کی خوشس منظرندی میں بہاؤ کی سمت بہتا چلا رہا ہو۔

موج شراب۔ موج گل و موج بے خودی
بہتا ہے رنگ و بو میں سفینہ بہار کا

زورق بہار کے ملاح کو چودھویں کے چاند کی جوانی اپنی جمال ارزانی سے سرمدی کیف عطا کر رہی ہے۔ ماحول کی جوانی سے قلب اثر پذیر ہو رہا۔ تصوراتی محبوبۂ دلنواز کا غیر محسوس نورانی ہیولیٰ ذہن میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کا حسن و جمال بھی مسحور کن ہے۔ عالم کیف و سرمستی ذہن و ضمیر پر مستولی ہے۔ اچانک پکار اٹھتے ہیں۔

راتیں بھی جواں۔ چاند کا ساغر بھی جواں ہے
شاعر بھی جواں۔ وہ بت کافر بھی جواں ہے
ساغر سے۔ ارادوں کے چھلکتی ہے جوانی
موسم بھی جواں بادۂ احمر بھی جوان ہے

ضیاء اپنے سینہ میں ایسا دل رکھتے جو ذوق و وجدان۔ کیف و مستی۔ سرور و نشاط اور جلال و جمال کی طمانیت بخش آغوش میں پلنے اور پروان چڑھنے کے باوصف کبھی کبھی دوسرے مشاغل و عوامل حیات کی جانب بھی ملتفت ہو جانے میں گونہ تسکین محسوس کرتا

ضیاؔ کی نگاہ سجیلے بھڑکیلے اور رنگین وحسین ایوانوں کی تعمیر وترتیب سے اثر پذیر ہونے والے مفلوک الحال انسان پر بھی پڑتی ہے۔ جو اپنے آپ کو دھرتی کی چھاتی کا بوجھ سمجھتے ہیں۔

ضیاؔ اس مزدور اور کارکن طبقہ کی بدحالی سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ جو تہذیب نو اور جدید معاشرہ کی ستم رانیوں کا شکار رہے۔ جو مغربی تعلیم وتربیت اور سرمایہ دارانہ کر و فر کے اثرات کے تحت مزدور کو زندگی بھر مزدور دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اور پھر انتباہ کے طور پر صاف صاف کہہ بھی دیتے ہیں۔ کہ یہ ایک ایسے عظیم انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ جسے کہ پیش از وقت تأثر سے نہ صرف انسان بلکہ فطرت بھی لرزہ براندام ہے۔ کہتے ہیں۔

ہے سامنے انقلاب کا زینہ ساقی
فطرت کا دھڑک رہا ہے سینہ ساقی
اس دور میں مغرب نے روا رکھا ہے
خونِ دلِ مزدور کا پینا ساقی

پسے اور کچلے ہوئے مزدور کو مخاطب کرتے ہیں۔

الٹے گا فلک نقاب۔ اک لمحہ ٹھہر
اٹھ جائیں گے خود حجاب اک لمحہ ٹھہر
اس رات کو کچھ اور سیہ ہونے دے
ابھریں گے ہزار آفتاب۔ اک لمحہ ٹھہر

ضیاؔ کی زندگی ایک پوری تجربہ گاہ معلوم ہوتی ہے۔ جہاں زندگی کے مختلف مراحل اور مسائل کے سلسلہ میں ان کے وسیع تر تجربات نمایاں ہیں۔ ضیاؔ کے فرمودات کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ کہیں ضیاؔ آپ نرے شاعر دکھائی دیں گے۔ کہیں حکیم اور مہندس کے روپ میں جلوہ گر ہوں گے۔ کہیں صوفی و درویش کا لبادہ اوڑھتے ہوئے کنج عافیت میں مصروفِ عبادت ہوں گے۔ تو کہیں رند بادہ خوار کے روپ میں ساغر و مینا کو اچھالتے اور میخانے کی معتدل فضا میں تندی و تیزی کے طوفان اٹھاتے

ہوئے نظر آئیں گے۔ تاہم ایک بات جو ہر روپ اور ہر لباس میں ضیاء کے شامل حال ہے۔ وہ ہے "خلوص" ضیاء نے کسی مرحلہ اور کسی گام پر خلوص کا دامن نہیں چھوڑا۔
ضیاء کی شاعری قنوطیت سے بالکل مبرا اور پاک ہے۔ ضیاء کی شخصیت باغ و بہار ہے۔ وہ غم و اندوہ۔ رنج و ملال۔ افسردگی و پژمردگی، پریشانی و اُداسی اور مصائب و آلام سے بہت دور۔ ایک ایسی فضا میں سانس لیتے ہیں اور لینا چاہتے ہیں۔ جہاں کیف و مستی ابتہاج و مسرت۔ خوش دلی۔ خوش کامی ہو۔ نقرئی قہقہے ہوں رنگین مسکراہٹیں ہوں۔ ہاؤ ہو کے مینا شکن نعرے ہوں۔ رامش و رنگ ہو۔ ساز و آہنگ ہو، ماحول شادان و فرحان ہو، اور زندگی رقصان ہو۔

ضیاء ایسی دنیا کا ہرگز قائل نہیں جس کی فضائیں آہ و بکا، اور نالہ و فریاد سے معمور ہوں۔ وہ دردِ غربت سے پھڑکتی تڑپتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کو جہانِ آب و گِل کی توہین سمجھتے ہیں۔ اور اُس کا مطالعہ اور ملاحظہ کرنے کی سکت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ ان کا نرم و گداز اور پُرخلوص قلب آلامِ حیات اور غربت و افلاس کی جیتی جاگتی تصویروں کی نمائش سے گریز کرتا ہے۔ اور اگر انہیں دنیا میں ہر لمحہ کے بعد رونما ہونے والا نیا حادثہ اور ہر لحظہ کے بعد وجود میں آنے والا نیا واقعہ ہر گام پر نئی ٹھوکر کھانے والی زندگی اور ہر موڑ پر بہک جانے والی آرزو اس کائنات کی تباہ کاری و درد آفرین کا یقین بھی دلائے۔ تو وہ مسکرا کر صرف اتنا کہتے ہیں۔

زندگی رقص ہے۔ اک لغزشِ مستانہ سہی
گردشِ چرخ سہی۔ گردشِ پیمانہ سہی
گنگناتی ہوئی دنیا ہے یہ دل کی دنیا
عقل ہے سر بہ گریباں تو میں دیوانہ سہی

ضیاء صوبہ سرحد کے ممتاز اور مایۂ ناز ادیب شاعر اور فنکار تھے۔ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ ضیاء کی شخصیت اور فن سے خوب واقف

ہیں۔ وہ مرنجان و مرنج اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر ادبی انجمن کی روحِ رواں رہے۔ بقولِ خود

رہے بہارِ چمن بن کے جس چمن میں رہے۔

اور بقولِ کسے ضیاء۔ ضیاء تھے۔ ضیاء سا کوئی ضیاء نہ ملا۔ میں نے ضیاء صاحب کی تاریخِ وفات کا مادہ نکالا ہے۔ مگر اسے قطعہ بننا اس وقت تک نصیب نہ ہُوا۔ مادہ یہ ہے۔

"ضیاء جعفری رفت بہ عدم"

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے۔

جناب محسن احسان۔

بزرگ شخصیت

ضیاء جعفری کو مرحوم کہتے یا لکھتے ہوئے مجھے میری زبان اور قلم دونوں لڑکھڑاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ضیاء صاحب ایک عجیب وضع قطع کی باغ و بہار شخصیت تھے۔ میری ملاقات ان سے بیس برس سے کچھ زائد عرصے ہی کی تھی۔ اور اس مدت میں میں نے انہیں کبھی رنجیدہ پژمردہ یا افسردہ خاطر نہیں دیکھا۔ وہ جب بھی ملے، جہاں بھی ملے جس حال میں بھی ملے۔ یا جن لوگوں کی محفل میں ملے۔ اُن کے چہرے کی شادابی، لب و لہجے کی شگفتگی اور انداز گفتگو کی شائستگی مجھے ہمیشہ متاثر کرتی رہی۔ متناسب قد و قامت، سرخ و سپید رنگ لمبی ناک مسکراتی آنکھیں کھلی پیشانی اور گہری بھویں، چغتائی کی کسی تصویر کی یاد تازہ کر دیتیں۔ جب میں نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تو مجھے اس بزرگ شخصیت کا ہر انداز اچھا لگا تھا۔ اور پھر ہر ملاقات کے بعد اس کے تاثر میں کچھ اضافہ ہوتا رہا۔

ضیاء صاحب مجھ سے اور میرے دوسرے ہمعصروں سے ہمیشہ انتہائی نرمی، شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کی باتیں بڑی شہد آفریں ہوتی تھیں۔ اور ان کا لہجہ بڑا ہی دلنواز ــــ وہ اکثر ہم دوستوں کو ستانے کی خاطر چھیڑ چھاڑ بھی کرتے۔ اس لیے کہ یہ چھیڑ چھاڑ ان کے مزاج کا خاصہ تھی۔ لیکن اس چھیڑ چھاڑ سے ان کی مراد کبھی کسی کی دل آزاری نہیں ہوا کرتی تھی۔ بلکہ ان کا یہ انداز قلبی لگاؤ کا ایک انبار تھا۔ وہ اپنی اس حرکت کے لیے ہمیشہ ایک پشاوری اصطلاح 'ہل ہلا' استعمال کرتے۔ اس سے لطف اٹھاتے اور دوسروں کو ہر ممکن طریقے سے محظوظ کرنے کی سعی کرتے۔ اس قسم کی 'ہل ہلا ہیں'، وہ اکثر و بیشتر اپنے ادیب دوستوں کے ساتھ کرتے۔ کیونکہ انہیں علم تھا۔ کہ یہ مذاق اسی طبقے سے مخصوص ہے۔ اور یہی لوگ اس کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اور ان کے ادیب دوست بھی ان کی اس بات سے ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے لطف اندوز ہوتے۔

جب میں نے ضیاء صاحب کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تو اس وقت وہ ایک نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ جامہ زیب تھے۔ اس لیے یہ سوٹ انہیں اچھا لگتا تھا۔ لیکن گذشتہ بارہ تیرہ برس سے یعنی فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد سوٹ کی بجائے وہ شیروانی پہنتے تھے۔ اس زمانے میں داڑھی مونچھ صاف تھی۔ شیروانی کا دور آیا۔ تو داڑھی رکھ لی۔ لباس مغربی طرز کا ہو یا مشرقی طرز کا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے ہر زمانے میں ضیاء صاحب کی زندگی پر مشرقیت کا غلبہ دیکھا۔ رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے، کھانے پینے میں وہ مشرقی روایت، تہذیب اور معاشرت کا ایک عمدہ نمونہ تھے۔ حج سے پہلے اور حج کے بعد دونوں ادوار میں ضیا صاحب کا مذہب کی جانب بے حد رجحان رہا۔ مشائخ عظام ان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ اور روحانی محفلوں میں وہ انتہائی ذوق وشوق سے شمولیت کرتے رہے۔ لیکن ادب سے لگاؤ اپنی جگہ رہا۔ ادبی نشستوں میں وہ انتہائی بے تکلف رہتے۔ اور ادیب اور شاعر دوستوں کی موجودگی میں ان کی طبیعت ہمیشہ ترنگ میں رہتی۔ یوں لگتا جیسے کونج ڈار سے بچھڑنے کے بعد پھر اس سے آملی ہو۔

ضیاء صاحب انتہائی فراخ حوصلہ، فیاض طبیعت، سیر چشم اور مخلص انسان تھے۔ مجھے کبھی بھی ان کی طبیعت میں انقباض یا افسردگی دکھائی نہیں دی۔ ان کی نگاہوں کی کشش، اُن کے چہرے کی حیات آفریں مسکراہٹ اور ان کی گفتگو کی بے پناہ حلاوت ہمیشہ ان کے ملنے والوں کے دلوں میں اُتر جاتی تھی۔ ان کی باتوں کا دھیماپن ان کی شخصیت کے نکھار کا باعث تھا۔ وہ جب بولتے تو ایسے لگتا۔ کہ بچوں کو کوہِ قاف پر بسنے والی پریوں کی دل نواز و دلگداز کہانیاں سنا رہے ہوں۔ اور ان کی گفتگو کے اسی دھیمے پن نے ان کی ذات میں ایک متانت، وقار اور ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ مجھے کبھی بھی ان کی شخصیت الجھی ہوئی نظر نہیں آئی۔ اور نہ ہی ان کی ذات میں کسی سرد یا گرم جنگ کا احساس ہوا۔ اور اسی لیے یہ سرد یا گرم جنگ ان کے وجود کے باہر بھی ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ کیونکہ ان کے قریب رہنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی کبھی کسی ایسی شکایت کا اظہار بر سبیل تذکرہ بھی نہیں کیا۔

ضیاء صاحب کی خندہ پیشانی اور شگفتہ خاطری کے باعث انہیں ایک بار ملنے کے بعد دوسری مرتبہ ملنے کی ہوس ضرور ہوتی۔ کیونکہ ان کی محبت اور شفقت کے ساتھ ساتھ ان کی علمی و ادبی گفتگو ذہن کے بعض بند دریچوں کو کھولنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی۔

ضیاء صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی۔ کہ ملنے والوں سے زیادہ دیر تک تکلف نہیں برت سکتے تھے۔ جوں جوں گفتگو آگے بڑھتی اور سلسلہ کلام مختلف موضوعات کی طرف بڑھتا۔ یہ تکلف کم سے کم تر ہوتا جاتا۔ اور یہ بے تکلفی ملنے والے کو ان کی ذات اور شخصیت سمجھنے میں بڑی مدد دیتی۔

ضیاء صاحب چاہے مسکرائے یا قہقہے لگائے۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ کو ہمیشہ ہونٹوں پر رکھ لیتے۔ جیسے ان کو یہ خوف ہو۔ کہ ان کے منہ کے زاوئے کہیں ان کے چہرے کی شگفتگی پر اثر انداز نہ ہو رہے ہوں۔ اگر کسی محفل میں زیادہ دیر تک انہیں سنجیدگی سے بیٹھنا پڑتا۔ تو وہ اسے "بوغمہ" کہتے۔ اور جونہی بے تکلف احباب کے حلقے میں پہنچتے۔ اس 'بوغمے' سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی چٹکلہ، کوئی لطیفہ، کوئی تجربہ یا کوئی واقعہ سنا کر خود بھی جی کھول کر ہنستے اور محفل کو بھی زعفران زار بناتے۔ ضیاء صاحب کے مزاج کی اسی طرحداری اور طبیعت کے اس بانکپن نے ان کی شخصیت میں ایک دلپذیر جاذبیت اور ایک دلنواز وجاہت پیدا کر دی تھی۔ اور اسی کی بدولت ان کی طبیعت میں کھردرا پن یا کرختگی نظر نہیں آئی۔ مجھے تو وہ اقبال کے اس مصرعے کی تفسیر لگتے ع جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب!!

ضیاء صاحب جب بھی اپنی جیب سے نسوار کی بوتل نکالکر تھوڑی سی ہاتھ پر ڈالنے کے بعد چٹکی میں دبا کر سونگھتے تو ایسے لگتا۔ جیسے کسی خوبصورت پھول کی بھینی بھینی خوشبو یا کسی عمدہ اور اعلیٰ عطر کی مہک سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے بھی شرارتاً اس مہک سے لطف اندوز ہونے کی سعی کی تھی۔ لیکن اتنی چھینکیں آئیں۔ اور اس قدر پانی ناک سے نکلا۔ کہ ایک لمحے کو یہ گمان گذرا جیسے دماغ ناک کے راستے سے بہہ گیا ہے۔ اور ضیاء صاحب میری اس حالت سے بڑے لطف اندوز ہوتے رہے۔

ضیاء صاحب حفظ مراتب کے قائل تھے۔ وہ بزرگوں، ہم عمروں اور چھوٹوں سے

اس طرح پیش آتے کہ ہر ایک کو یہی خیال آتا۔ کہ وہ میرے بہترین رفیق، اعلیٰ ساتھی اور مہربان دوست ہیں۔ شفقت، محبت اور نرمی و ملائمت کا اظہار، قدم قدم پر ہوتا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اور وہ شاید یہ کبھی کر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ نیکی اور شرافت ان کی شخصیت میں اس قدر گہری جڑیں پکڑ چکی تھیں۔ کہ ان سے کسی برائی کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ نیکی اور شرافت کو انسانیت کی معراج سمجھتے تھے۔

میرے خاندانی حالات کچھ اس قدر دگرگوں ہوئے کہ میں نے اگست ۱۹۵۱ میں ایبٹ آباد میں ایک ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میری روانگی سے ایک شب قبل جب تمام احباب حسبِ معمول فارغ صاحب کی بیٹھک میں اکٹھے ہوئے۔ تو اس رات موضوع گفتگو میری نئی ملازمت اور پشاور سے روانگی تھی۔ میں بے حد غمگین اور اداس تھا۔ نوکری کے سلسلے میں پہلی مرتبہ سفر پر جانے کی پریشانی تھی۔ گھر چھوڑنے کا دکھ تھا۔ نئے حالات سے دوچار ہونے کی الجھن تھی۔ ادبی ہنگاموں اور ادبی محفلوں سے بچھڑنے کا قلق تھا۔ پشاور کے گلی کوچے جن میں میری زندگی کے دلکش اور دلپسند لمحے دفن ہیں، ان سے دوچار ہو جانے کا غم تھا۔ اپنے بے حد عزیز دوستوں سے دوری کا ملال تھا۔ اور ایک نئے اور اجنبی ماحول میں زندگی گزارنے کی پریشانی تھی ــــ میں عجیب گومگو کے عالم میں تھا۔ ایک طرف اپنی جذباتی وابستگیوں کو چھوڑنا اور دوسری طرف ایک نئی صورت حالات کا مقابلہ ــــ اس رات ہم فارغ صاحب کے ہاں بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ تمام دوست حسبِ معمول ہلا گلا کرتے رہے۔ اور ان میں ضیاء صاحب بھی شامل تھے۔ محفل برخاست ہونے کے بعد میں اور میرا ایک عزیز دوست مہر دل درانی ضیاء صاحب کے ہمراہ چوک یادگار تک آئے۔ اور یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے مجھے زندگی کی کشمکش میں جوانمردی سے حصہ لینے کا سبق دیا۔ مجھے جذبات کی بجائے عقل و شعور سے کام لینے پر اکسایا۔ اور مجھ میں وہ جرأت اور حوصلہ پیدا کیا جس کی بدولت میں تین سال تک ایک غیر شاعرانہ ملازمت کے ساتھ بڑی پامردی کے ساتھ الجھا رہا۔ لیکن کبھی پژمردگی کو پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ اگر ضیاء صاحب کے وہ الفاظ نہ ہوتے۔ جو جادو کا کام کرتے۔ تو شاید میری شخصیت ٹوٹے ہوئے شیشے کی کرچیوں کی طرح بکھر گئی ہوتی۔

ضیاء صاحب کو گذشتہ دس برس سے دینی اور روحانی مجالس میں زیادہ اور ادبی محفلوں میں کم دیکھا گیا۔ لیکن بالکل ختم نہیں ہؤا۔ جب بھی ان سے ادب کی کوئی بات ہوتی تو ایسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ ایک مانوس سی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ اچھے شعر کو سنکر جھومتے اور بار بار پڑھوا کر سر کو ایک خاص انداز میں جنبش دیتے اور شعر سے لطف اندوز ہوتے۔

آج ہم سب یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ ضیاء صاحب ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ وہ مر گئے لیکن مجھے کچھ یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ مرے نہیں۔ وہ ہمارے اور آپ کے درمیان موجود ہیں۔ یہیں کہیں۔ صرف ہماری کوتاہ نظریں ان کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اگر ہم ان کی تلاش کر سکیں تو وہ یقیناً بقول جوشؔ :-

اے شخص اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ رنداں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا رندِ خوش اوقات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا

اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ جاناں میں ملے گا

اور ہو گا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

جناب خاطر غزنوی

سید ضیاء جعفری

روشن یادیں اپنے ضیاء کی

عجیب اتفاق ہے کہ میری پہلی ملاقات سرحد کے تین اہم شعراء سے بیک وقت بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ میرے ایک قریبی عزیز کی شادی تھی۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ اس شادی پر ان تینوں شعراء نے سہرے لکھے تھے۔ جب سہرا چھپ کر آیا۔ تو اس میں سبھی سہرے "گھسے پٹے" تھے۔ یعنی "کثرتِ استعمال سے اتنے عام ہو چکے تھے۔ کہ ان کے بدلے نئی مشہدی لنگی دینا مجھے گوارا نہ تھا۔ لیکن میرے عزیز تین مشہدیاں خرید کر لوٹانے کے قائل نہ تھے۔

برات کی رات جب چھپے ہوئے سہرے تقسیم ہوئے۔ تو اپنے قریب بیٹھے ہوئے چند اجنبیوں کی ادبی باتوں نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا۔ اور بات سہروں ہی کی چل پڑی۔ میں نے دل کا غبار نکالا۔ ان سیکنڈ ہینڈ سہرے لکھنے والوں کی غالباً برائی بھی کی۔ ایک صاحب نے بڑے زوروں سے میری ہاں میں ہاں ملائی۔ اور یہاں تک کہہ گئے۔ کہ "یہ ضیاء جعفری — چور شاعر ہے، سنا ہے کسی سے لکھوایا کرتا ہے"— انہوں نے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کے بارے میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں کیں، ———

"چوری ووری کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا، صرف اتنا جانتا ہوں۔ کہ یہ سہرے کرائے کی گراگری کی طرح دوسری شادیوں پر بھی سپلائی ہو چکے ہیں"۔ میں نے ان صاحب سے کہا ———

کھلتا ہوا رنگ، گھنی بھنویں، یونانی ناک سر مے کے بغیر بڑی بڑی چغتائی آرٹ آنکھیں جتنی باتیں کرتے تھے، کار کے وائپر کی طرح اتنی ہی مرتبہ ہاتھ بھی ہلاتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ ان کی باتیں یا ہاتھ کہہ لیجئے۔ عام آدمی کے ہاتھوں سے زیادہ لمبے ہیں۔ اور جب سہرا پڑھنے کے لیے ان صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے حضرات فارغ بخاری اور رضا ہمدانی بن گئے ـــــ تو مجھے حیرت ہوئی۔ کہ یہ صاحب ان شعراء کو سامنے بٹھا کر گالیاں دے رہے تھے ـــــ اور جب وہ خود ضیاء جعفری بن کر سہرا پڑھنے گئے۔ تو مجھے احساس ہوا۔ کہ انہوں نے اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا تھا ـــــ

اور حقیقت یہی ہے کہ ضیاء جعفری مذاق کے معاملے میں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا کرتے تھے۔ اکثر یوں ہوا کہ ہزل یا ہجو کا کوئی شعر ہو رہا ہے۔ اور اس میں ان کا اپنا نام موزون ہو رہا ہے۔ تو وہ بلا جھجک اس مصرعے میں دشمن کے بجائے اپنا نام استعمال کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی نے ان کو واقعی باغ و بہار آدمی بنا دیا تھا۔ وہ خود طب کی پریکٹس کرتے تھے۔ اور لوگوں کے مزاجوں میں بلغمی اور بادی تاثیریں ڈھونڈتے تھے۔ لیکن خدا جانے انہوں نے کبھی اپنے متعلق یہ سوچا تھا یا نہیں کہ ان کا اپنا مزاج زعفرانی تھا ـــــ میں نے ان کے مطب میں بیٹھے ان کی مریضوں سے گفتگو بھی سنی۔ مریض ان کے زعفران زار ماحول میں آکر نصف صحت حاصل کر لیا کرتا تھا،

وہ شروع سے فقیر منش تھے۔ مریض پر نصف اثر ان کی درویش صفت طبیعت کا پڑتا تھا ـــــ یہ خدا ہی جانتا ہے۔ کہ مریضوں کی صحت یابی میں دوا بھی کام کرتی تھی یا نہیں

ضیاء صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد مجھے نئی مشہدی ضائع جانے کا افسوس شاید ہوا ہو۔ لیکن ان کی شگفتہ مزاجی نے مجھے دائرہ ادبیہ کا رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ دائرہ ادبیہ میں فارغ رضا، ڈاکٹر قمر صاحب، ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس سے ملاقاتیں ہوئیں۔

ـــــ دائرہ ادبیہ ایک دبستان تھا۔ جہاں کم از کم میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔

لوگوں کو ڈاکٹر عبدالودود قمر صاحب کے لیموں والے قہوے کا چسکہ وہیں پڑا۔ ڈاکٹر قمر نے اس زمانے میں چند غزلیں بھی کہیں تھیں۔ عمر بھر ہم ان سے وہی چند غزلیں سنتے آئے ہیں۔ لیکن ان کے لیموں میں ایسا ادبی اثر تھا۔ کہ جس نے بھی دائرہ ادبیہ کا قہوہ پیا۔ گویا وہ ادب و شعر کے غیر فانی جراثیم لے کر گیا۔ ڈاکٹر قمر کے قہوے

نے کئی نوجوانوں کو شاعر بنا دیا۔ اور ضیاء صاحب کی صحبت نے ان نوجوانوں کی شاعری کو جلا بخشی —— ضیاء صاحب شاہ ولی قتال کے دروازے سے ملحق دائرہ ادبیہ کے ننھے سے کمرے کے باہر چارپائی پر یا سردیوں میں کمرے کے اندر تکیئے سے ٹیک لگائے ہمیشہ نیم دراز پڑے رہتے تھے۔ نسوار کی چٹکی سے نتھنوں کو غذا وقتاً فوقتاً پہنچاتے رہتے۔ اور نوجوانوں کو ان کے اچھے شعروں پر دل کھول کر داد دیتے۔ ان کی مخلصانہ داد کی پہچان یہ تھی۔ کہ سرہانے بندھے ہوئے ہاتھوں کو اچانک جدا کر کے بیٹھ جاتے۔ اور پڑھنے والے کی طرف پورا رخ کر کے پھیپھڑوں کے پورے زور کے ساتھ اسے داد دیتے، اور کبھی کبھی داد دیتے ہوئے اپنے لمبے لمبے ہاتھوں کو پڑھنے والوں کی طرف اتنا بڑھاتے۔ کہ پڑھنے والے کو سہم کر پیچھے ہٹنا پڑ جاتا ——

وہ دائرہ ادبیہ، ادبستان اور انجمن ترقی اردو کے بانیوں میں سے تھے۔ انہی کی سرپرستی میں ان اداروں نے سرحد میں علم و ادب کا چراغ جلائے رکھا۔ اور نئے نئے شعراء پیدا کئے۔

ضیاء صاحب نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی —— ایک دو واقعات تو ایسے ہوئے جنہوں نے میری زندگی کی ڈگر ہی بدل دی۔ اور مجھے روشن راہوں پر ڈال دیا۔ میں ضیاء صاحب کے اس فیضان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ ۱۹۴۵ — ۴۶ء میں وہ ایک نیم سرکاری رسالے "تعمیر نو" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے سب دوستوں سے تعاون کے لیے کہا ——

ندیم قاسمی صاحب نے اس ہفت روزہ کے سرورق کے لیے شعر لکھا، فارغ نے سرحدی شعراء کا تعارف اپنے ذمے لیا۔ —— میرے ذمے عورتوں اور بچوں کا صفحہ آیا —— ایک دن ضیاء صاحب نے فرمایا۔ کہ بچوں کی ذہنی آزمائش کے لیے معمہ ہونا ضروری ہے، میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے انہیں ایک معمہ تیار کر کے دے دیا۔ —— معمہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے ——

ان کے یہ الفاظ میں کبھی نہ بھولوں گا "بھئی تم نے کمال کر دیا۔ میں تو ایسا معمہ تین ماہ میں بھی تیار نہ کر سکتا۔ اور ان الفاظ نے میری اتنی ہمت افزائی کی۔ کہ میں اس سے بہتر معمے تیار کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے لگا۔ اور اس مطالعے نے فکری اور ذہنی طور پر مجھے آگے بڑھایا ——— یہ دوسری بات ہے۔ کہ انہوں نے یہ بات میری حوصلہ افزائی کے لیے کہی ——— ورنہ وہ اس سے کئی گنا بہتر معمے اس سے آٹھ گنا کم وقت میں تیار کر سکتے تھے۔

دوسرا واقعہ جس نے میری زندگی کے لیے ایک واضح راہ متعین کی۔ بظاہر بڑا معمولی ہے۔ لیکن اس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ——— فارغ رضا کا گھر صرف سنگِ میل کا دفتر ہی نہیں تھا۔ بلکہ دائرہ ادبیہ بھی گویا یہیں منتقل ہوگیا تھا۔ سنگِ میل کی کاپیاں پڑھی جا رہی تھیں۔ میں پڑھ رہا تھا۔ اور رضا کاپیوں کی غلطیاں لگا رہا تھا۔

جب میں نے پشتو اشعار پڑھنے شروع کئے۔ تو مجھے بھی لطف آیا۔ اور لہک لہک کر پڑھنے لگا۔ شعر کی روانی نے لذت میں اضافہ کر دیا تھا۔ ضیاء صاحب بھی سن رہے تھے، ایک نعرہ مار کر اٹھ بیٹھے۔ اور مجھے روک دیا۔ کہا پھر پڑھو ——— میں نے شعر پھر پڑھا، ——— خوب لطف لیا۔ پھر کہا پھر پڑھو۔ ——— غرض وہ شعر بار بار پڑھوایا۔ اور پھر داد کے طور پر مجھ سے کہا۔ "بہت اچھی پشتو پڑھتے ہو"۔

بس صرف ایک فقرہ ——— "بہت اچھی پشتو پڑھتے ہو"۔

اس فقرے نے میری کایا پلٹ دی۔ اور پشتو زبان سے میری محبت دہ چند ہوگئی۔ شاید یہی فقرہ تھا۔ جس نے پشتو کو میرا اوڑھنا بچھونا بنا دیا ——— یہی فقرہ تھا۔ جس نے میری ہمت بندھائی۔ کہ میں پشتو فاضل کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کروں ——— یہی خوبی ضیاء صاحب کی تھی ——— اس چیز نے خدا جانے کتنے نوجوانوں کو آگے بڑھنے، اونچا اڑنے اور وسعتوں پر چھا جانے کا

حوصلہ دیا ہو گا، کتنے مریض ہوں گے۔ جو ان کے میٹھے بولوں، دلکش گفتگو اور شیریں طبعی سے صحت یاب ہوئے ہوں گے۔ اگرچہ وہ خود عمر بھر کئی روگ اپنے جسم سے لگائے رہے۔ اور انہیں ایسے بول کہنے والا کوئی نہ ملا۔

نہ جانے کتنے مرید ہوں گے، جن کی پیٹھ ٹھونک کر انھوں نے انہیں طمانیت قلب بخشی ہو گی۔

یہ ان کی طبیعت، ان کی زندہ دلی، ان کی بے لوث محبت، ان کی شفقت کا اثر ہے۔ کہ فراز جیسا باغی ان کی میت پر شاید زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا ـــــ اس وقت اس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے ـــــ

"ضیاء صاحب ـــ پھر آپ کی صحبت کہاں نصیب ہو گی؟"
پھر آپ کے پیچھے کون نماز پڑھ سکے گا ـــــ؟
ضیاء صاحب یہ آپ ہی ہیں کہ مجھ کافر سے نماز پڑھوا رہے ہیں"۔
ضیاء صاحب کی شخصیت گویا روشنیوں کا ایک شہر تھی،
ہر روشنی کا ایک الگ رنگ ایک الگ مزاج تھا،
شاعری کی رنگین روشنی، حسن پرستی کی تجسس روشنی۔
ایک کھلنڈرے، غیر سنجیدہ اور خوش باش مزاج کی جوان روشنی۔
ایک صاحبِ دل، سنجیدہ اور مودب شخصیت کی نرم روشنی،
ایک درویش۔ ایک خوش گفتار، حکیم کی صحت مند روشنی،
ایک قلندر،
ایک مسلمان
ایک مبلغ

اور ایک پیر کامل کی راہنما روشنی،

وہ شاعر تھے، حسن وعشق کے شاعر، شاہد وشباب کے شاعر، ساغر ورباب کے شاعر، ان کی شاعری جوانی کا پیام تھی، مستی کا الہام تھی، رنگین، مترنم، جوان، دلکش،

ان کی غزلوں میں جھومتی گھٹاؤں کا رقص، غزالوں کا رم، شرابوں کی لذت، محبوباؤں کے معطر اجسام کی خوشبو، روشینوں کا لمس، اور نشوں کی کیفیت تھی۔

ان کی شخصیت کا ایک پہلو، کھلنڈراپن، غیر سنجیدگی اور خوشباشی بھی تھی — ان کی موجودگی سے محفل زعفران زار رہتی — اور کسی دوسرے کی بات داد نہ پاسکتی۔

مذاق، چہلیں، لطائف، چھیڑ چھاڑ — قہقہے — ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ ۱۹۴۴ کی ایک تاریک رات کا ذکر ہے، تاریک رات اس لیے کہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اور راتوں کو اکثر بلیک آوٹ ہوا کرتا، دائرہ ادبیہ کی محفل ختم ہوئی۔ اور شعراء کی ٹولی واپس گھر کو چل پڑی، ان دنوں اکثر ایسا ہوتا کہ یہ سبھی شعراء یکجا جاتے۔ ایک ایک کو گھر چھوڑتے ہوئے آخر میں ضیاء صاحب تنہا رہ جاتے کہ وہ سب سے دور گنج میں رہا کرتے تھے — کوچہ رسالدار کی تاریک ساباطوں کے نیچے سے گذرتے وقت صرف تین شخص رہ گئے تھے۔ ان میں فارغ اور ضیاء صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ اچانک ضیاء صاحب کو مذاق سوجھا — زمین پر بیٹھ گئے۔ اور گلی کے اینٹوں کے پختہ فرش پر ہاتھ مار کر چلّانا شروع کیا۔ میں ضیاء نہیں ہوں — کوئی اور چیز ہوں — ہُو — ہُو — جنگ کا زمانہ آدھی رات، بلیک آوٹ — اس ہُو ہُو سے کس کا زہرہ آب نہ ہوتا — فارغ نے چلّانا شروع کیا — خدا کے لیے ضیاء صاحب واپس آجایئے —

ضیاء صاحب نے پھر زمین پر دو ہنٹر مارا ——— اور چلا کر کہا۔
" نہیں نہیں ——— ہرگز نہیں "

——— ٥ ———

کبھی کبھی وہ عبدالرحمان چغتائی کی تصاویر کا نقش کھینچتے۔ ——— ایک عجیب چیز بن جاتے۔ ٹانگ کو کھینچ کر گردن پر رکھ دیتے۔ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو جاتے اور کہتے یہ ہے وحشی مجنوں کی تصویر ———
کبھی دونوں آنکھوں کے گوشوں کو کھینچ کر آنکھوں کو لمبا بنا دیئے۔ کہتے یہ ہے چغتائی کی محبوبہ کی آنکھوں کا تصور ———

——— ٥ ———

کبھی کبھی وہ عجیب و غریب طویل بحر کے قدیم فارسی کے شعر سناتے ——— اور ہنسا ہنسا کر پیٹیوں میں بل ڈال دیتے۔

——— ٥ ———

لیکن ان سب تماشوں کی تان ——— " اللہ " پر ٹوٹتی ——— ایک گہری اور دل سے نکلی ہوئی آواز ———

اور فارغ کہہ اٹھا۔ ضیاء صاحب کی دینیات کی گھنٹی بج گئی ———
یہ دینیات کی گھنٹی ان کی جوانی کے زمانے سے بجنی شروع ہوئی تھی۔ شاید اس درویش کا فیضان تھا۔ جو جوانی ہی میں ان کو اپنے رنگ میں رنگ گیا تھا۔
پھر میں نے ان کو اکثر محفل میں بیٹھے بیٹھے روتے بھی دیکھا ——— وہ چپکے سے آنسو پونچھ لیا کرتے اور اپنے مزاج کے اس پہلو کو تشہیر سے بچاتے۔
شاعری کی محفلوں سے ریٹائر ہو کر انہوں نے ایک الگ محفل قائم کر لی۔ اللہ اور رسول کا ورد ہونے لگا۔ ختم قرآن کی محفلیں سنورنے لگیں ——— قوالیاں ان کی مستی کو ہوا دینے لگیں ———
ان کے گرد کئی معتقدوں اور مریدوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ پھر یہ محفلیں خانقاہوں اور

پیرخانوں میں برپا ہونے لگیں، ہر سال عرس کے لیے لاہور، فیروز پور روڈ کی رونقیں بڑھنے لگیں۔ نئی وہ باقاعدہ پشاور کے لیے جانشین مقرر ہو گئے ۔۔۔ اور مجھ جیسے گنہ گاروں کی راہبری اور راہنما کے فرائض انہوں نے سنبھال لئے ۔۔۔ ضیاء صاحب سے ان دنوں میری اکثر ملاقاتیں ہوتیں ۔۔۔ لیکن ضیاء صاحب سے آخری ملاقات ۔۔۔ ان سے پہلی ملاقات کی طرح کبھی نہ بھول سکوں گا ۔۔۔ ان کی بیماری کی خبر سنی، تو فارغ اور میں اکٹھے ان کے ہاں پہنچے وہاں نیازی صاحب اور اختر پہلے سے موجود تھے ۔۔۔ اس دن ضیاء صاحب کی طبیعت بہت ہی اچھی تھی ۔۔۔ شاید چراغ کی آخری چمک تھی۔

کوئی دو گھنٹے ہم ان کے ساتھ رہے۔۔ ان کی یادداشت بہت تیز ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے سارے پرانے واقعات دہرائے۔ ان محفلوں کی لذت کا ذکر کیا۔ قہقہے لگائے۔ ایک ایک دوست کو یاد کیا۔ ان کی خصوصیات کا ذکر کیا۔ اور آخر میں رو دیئے۔ شاید ان پر اس آخری محفل کی حقیقت کا کشف ہو چکا تھا ۔۔۔ ہم نے ان سے کہا ۔۔۔

"ضیاء صاحب، اللہ کا کرم ہے۔ آپ تو اب بالکل صحت مند ہو گئے ہیں۔"

کہنے لگے۔

بہت دنوں بعد دل کا غبار نکلا ہے ۔۔۔ لیکن زندگی کا انجام معلوم ہے۔ میں اپنے بارے میں خوب جانتا ہوں ۔۔۔ کیا ہونے والا ہے۔" ۔۔۔ ہم واپس آ گئے،

دوسرے دن سنا کہ ضیاء صاحب کی حالت تشویشناک ہو گئی ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں ۔۔۔

مجھے رات دیر سے اطلاع ملی۔ ۔۔۔ میں اسی وقت ہسپتال پہنچا۔ رات کو کوئی ڈیڑھ بجا ہو گا۔

ضیاء صاحب کو سانس کی بڑی تکلیف تھی، بلغم سانس لینے میں حائل تھا۔ وہ ہوش میں نہ تھے۔ آکسیجن لگی ہوئی تھی۔

اچانک آنکھیں کھولیں ۔۔۔ میری طرف دیکھا ۔۔۔ ذرا مسکرا کر مجھے

ایک طرف ہو جانے کا اشارہ کیا ـــــ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ اور انہوں نے پوری پوری قوت سے کھانس کر بلغم نکالا اور تھوک دیا ـــــ

اور پھر جیسے ذرا سی دیر کے لیے وہ پھر بے ہوش ہو گئے ـــــ

آغا مبارک حسین عاجز کے برخورداران کی دیکھ بھال کر رہے تھے ـــــ انہوں نے ڈاکٹر کو بلایا۔

دوسرے دن ان کے سارے عزیز، رشتہ دار، دوست، معتقدین ہسپتال میں جمع تھے، کوئی رو رہا تھا، کوئی دعائیں مانگ رہا تھا۔ کسی کو چپ لگی ہوئی تھی۔ ایک اداسی سارے وارڈ اور اس کے باہر پھیلی ہوئی تھی ـــــ

اور آخر اس امید اور ناامیدی کی فضا نے غم و اندوہ کی شکل لے لی۔ وہ روشنیوں کا شہر اچانک اندھیروں میں ڈوب گیا ـــــ جیسے بلیک آوٹ ہو گیا ـــــ

اور جیسے ان اندھیروں میں فارغ کی آواز گونج رہی ہو ـــــ

"ضیار صاحب واپس آجائیے"۔

شمیم بھیروی۔

محاسنِ کلامِ ضیاؔ

شعر و شاعری جسے بہتر الفاظ میں تخئیل شعور کا ایک محسوس جذبہ کہا جا سکتا ہی اور جس کی بنیاد نہ صرف جولانیٔ خیال پر ہی قایم ہے۔ بلکہ زیادہ تر حسنِ ادراک ہی اس منزل کی تکمیل ترفیع کے اسباب ہیں۔ ہم جب ان کی فارسی شاعری پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو ان کے طرزِ بیان میں بعض اوقات بے اختیار نظیریؔ اور غالبؔ مغفور یاد آجاتے ہیں۔ نظیریؔ ان کی جان ہے، اور غالبؔ ان کا محبوب۔ خود فارسی ادب و زبان پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ چونکہ ایرانی النسل ہیں۔ اور اب تک خاندان میں فارسی بولی جاتی ہے۔ اس لیے جہاں جہاں اردو میں بھی فارسی کا استعمال کیا ہے۔ وہاں وہ فارسی انگوٹھی میں نگینے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور مذاق سلیم پر گراں نہیں گزرتی۔ وہ بعض ترکیب پرست شعراء کی طرح شعر کو ایسی لفظی الجھنوں میں مبتلا نہیں کر دیتے۔ جہاں ناظر و سامع بجز تاویل و تحریف کے کچھ نہ کر سکیں۔ جہاں جہاں سید ضیاؔ، تراکیب کا استعمال کرتے ہیں۔ وہاں ان کی دلکشی اور ابہام فہمی میں قطعاً کلام نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ؎

مصور:- وہ سحر نغمہ جسے سازِ بے صدا کہیئے
وہ شعریت کہ جسے پیکر ادا کہیئے

"سحر نغمہ"، "پیکر ادا"، اور "سازِ بے صدا"، عام فہم تراکیب ہیں اور شعر بھی نہایت بلند۔ اس قسم کی مثالیں آپ کو جا بجا کلام ضیاء میں ملیں گی۔

بندش اور محاکات ضیاء، کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں۔ جو انہیں اپنے ہم جنس شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔۔ انتہائی یاس اور بے مہری عالم کا نقشہ کھینچتے ہیں:-

ے نادم طبیب موت قریب آشنا بعید
حسرت سے آسماں کی طرف دیکھتا ہوں میں

ہنگامِ نزع کا مکمل مرقع ہے۔ آشنا تو آشنا ایسے وقت میں مرض بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ "طبیب کی ندامت" اور حسرت سے آسماں کی طرف دیکھنا کتنا سچا منظر ہے۔ اس ضمن میں مجھے اپنا ایک شعر یاد آگیا۔

ے تا آں کار جنونم کنارہ از من کرد لبم خموش و نگاہم بہ آسماں بنگر

حسن تخلیق ہو رہا ہے۔ اور شاعر اس کی تصویر کھینچتا ہے۔ ے

فطرت کا ماحصل ہے کرامت شباب کی رنگینیاں شفق کی ہیں بوندیں شراب کی
گویا کہ جاگ اٹھی ہے دامانِ شرق سے انگڑائی لے کے پہلی کرن آفتاب کی

قطعہ لامحدود وسعتوں کا حامل ہے۔ کاش، میں چغتائی ہوتا۔ اور اس چیز کو خطوط اور رنگ میں پیش کر کے بتا سکتا۔ کہ شاعر نے تخلیقِ حسن کی کتنی بلند تصویر کھینچی ہے۔

طلسم شب ٹوٹ چکا ہے۔ شفق کے لال لال ڈورے شراب برسا رہے ہیں۔ اور خوابستان مشرق سے عروس آفتاب کرنوں کی انگڑائیوں کے ہجوم میں بیدار ہوتا ہے، اور شاعر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

ے فطرت کا ماحصل ہے کرامت شباب کی

گویا جوانی سے اپنا معجزہ سمجھ رہی ہے۔ کہ سرخ و کبود بدلیاں۔ یہ کیفیات شفق اور تخلیق حسن آفتاب میری ہی کرامت ہیں، ایسی تصویریں آپ کو آئندہ صفحات میں بھی نظر آئیں گی۔

ضیاء کی شاعری کا ماحصل روحانیت ہے نہ کہ مادیت۔ وہ مجاز کی تمام تر ناتوانیوں کو کچل کر حقائق کی سطوت اور بقائے دوام میں رواں دواں ہے۔ وہ حسن آشنا ہوتا ہے۔ تو حسن حقیقت سے، اس کی بیداری آنکھ کی بیداری نہیں،

دل کی بیداری ہے۔ اور یہ بیداری حقیقت میں اس کی اپنی نمود ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں ہم کہہ سکتے ہیں۔ ؎

زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست　　　تجلّی دگرے درخورِ تماشا نیست

اور اس تعلقِ حسن کو اس رنگ سے سید صاحب پیش کرتے ہیں۔ ؎

تا تجلائے تو شد رونقِ بزمِ تخلیق　　　ہمچو آئینہ بہ عکسِ تو گرفتار شدم

یہ ہے شاعر کی نمود جو ہے منتہائے عشق اور حیاتِ عشق۔ اور تکمیل منزل کے بعد وہ ان رنگین وادیوں میں جلوہ آرا ہے۔ جمالِ حسن ہے۔ تو لامحدود اور عشق ہے تو کمالِ حیات ہے۔ اور یہاں علی الاعلان کہہ اٹھتا ہے۔ ؎

بلند از گل و آب ست آشیانۂ ما　　　بہ بزمِ عالمِ روحانیاست خانۂ ما

انسانی محسوسات کی رفعت اس وقت تک درخورِ اعتنا نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ خود اپنی ہستی سے باخبر ہو کر یہ نہ کہہ اٹھے۔ کہ "میں ہوں" اور "محبت و عشق" کی "نکبت و فلاکت" کے فریب کو جھٹلاتے ہوئے اور سطحیات سے گزرتے ہوئے یہ نہ کہدے۔ کہ جہان وفا کی تمام تر تابندگیاں میرے ہی دم سے ہیں۔ ؎

وہ عشق ہوں ضیائے جہانِ وفا ہوں میں　　　وہ حسن ہوں کہ سر سے قدم تک حیا ہوں میں

روشن میرے نیاز سے ہے جلوہ گاہِ ناز　　　ہوں نقشِ پا۔ چراغِ حریمِ وفا ہوں میں

ضیاء ایک فطرت شناس دل لے کر آئے ہیں۔ ان کی روح پر وہ پرتو پڑا ہوا ہے۔ جو انہیں تجلیات الٰہی میں ایک عرصہ تک آوارہ رکھکر انہیں اس جلوے سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ جہاں ؎

دنیائے آب و گل تو نہیں یہ عالمِ دل ہے مگر

میں روح کے پردے پردے میں انوارِ خدا کو دیکھتا ہوں

یہ محسوسات ہیں۔ سطحیات نہیں۔ شعر کے تیور کہہ رہے ہیں۔ کہ شاعر پر یہ سب کچھ گذرا ہے، سنی سنائی نہیں۔ یا قافیہ پیمائی نہیں۔

استغنا، وفقر شعراء کی طبائع کا خاصہ رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں فقر کی وہ منزل جہاں فقر رہبانیت نہ ہو۔ وہی ارشاداتِ الٰہیہ کے تحت میں فقر کہلاتا ہے۔ اور یہ فقر نہیں ہے۔ جہانبانی ہے۔ بخودی منتہاء فقر نہیں خودی مجسم فقر ہے۔ اور اس مقام پر پہنچ کر ہمارا شاعر کہتا ہے۔ ؎

غایتِ فقر ما جہانبانی ست　　تختِ شاہی ز بوریا طلبیم

از خودی تا خدا رسیم آخر　　ما کہ از خویشتن خدا طلبیم

دوسرا شعر بلاغتوں کی جان ہے۔ خودی و عزتِ نفس معرفتِ الٰہیہ کے بہترین فلسفے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کی مکمل تفسیر ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دورئے مرکز و مقام ایک بلائے مستقلہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

من کہ ز خیلِ قدسیاں بستہ آب و گل شدم

من بہ بلائے آب و گل آب و گل ام بلائے من

نزاکتِ تخیل کے باب میں ضیاء کی پردازیاں قابلِ داد ہیں، اور اس چیز میں بھی وہ اپنے رنگ سے دور نہیں جا سکے :۔ ؎

یہ کس نے مضطرب نظروں سے چھیڑا سازِ ہستی کو

نوائیں تھرتھرا کر اٹھ رہی ہیں بربطِ دل سے

زندگی کی تگ و دو اور اشارۂ آفرندہ حیات، اس سے زیادہ لطیف بیان کا محتاج نہیں، معشوق خطراتِ محبت سے آشنا ہے، وہ سازِ ہستی کو چھیڑ دیتا ہے، محبت کو پیکرِ وجد میں دیکھنا چاہتا ہے، ساز اٹھاتا ہے۔ لرزتی ہوئی انگلیاں اور بیقرار نگاہیں زیر و بم نغمہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر اعجاز الرحمٰن

ذاتی تاثرات

(۱)

مجھ جیسے عام دنیادار آدمی کا ضیاء جعفری پر لکھنا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ آغا مرحوم طریقت کی جن منزلوں اور مقامات سے گذرے تھے۔ ان کا تصور بھی میرے بس میں نہیں۔ اس کے علاوہ میری ان سے ملاقات بہت کم رہی۔ صرف ایک مرتبہ ایک بے تکلف محفل میں دیکھا۔ اور پھر وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ کچھ سنی سنائی۔ باتیں اختر جعفری سے معلوم ہوئیں۔ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن سے ہم صدیوں ملتے جلتے رہیں۔ پھر بھی ان کے ذہن و دماغ کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ پراسرار شخص آج کل کے دور میں بہت عام ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن سے انسان بہت کم مل سکتا ہے۔ مگر وہ اتنا گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ جو کسی طور بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہ وہ مقام ہے۔ جو بڑی ریاضت، جان فشانی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر یقین رکھتے ہوئے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے بزرگ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ضیاء مرحوم ایسے بزرگوں میں سے ایک تھے۔ ان کا مذہب انسانیت تھا۔ کیونکہ وہ صوفی تھے۔ صاحبِ طریقت تھے۔ اور نہ جانے کتنے ستم جھیلنے کے بعد انہوں نے دوئی اور تعینات کے پردے اپنی ذات پر سے ہٹا دیئے تھے۔ اور آخر ایک دن اس نورِ ازلی میں پیوست ہو گئے جو ان کی دلی اور آخری خواہش تھی۔ ان کی شخصیت کا بڑا وصف یہی تھا۔ کہ ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ جس میں جگہ جگہ حکمت و اخلاق کے نکتے، اکابرِ دین سے محبت خدا کی ذات کا شدید احساس اور نوجوان نسل کے لیے ایک پُرعظمت لائحہ عمل و اخلاق تھا۔ زمانہ بہت سے رنگ بدلے گا دنیا میں طرح طرح کے لوگ آئیں گے۔ جن میں عالم بھی ہوں گے صاحبِ طریقت بھی دنیاداری کے ماہر بھی، مگر ضیاء جعفری ان میں نہ ہوں گے۔ بزرگوں کی یہ کھیپ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئی، ایسی انسان دوست ہستی اب ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔

(۲)

وہ شخص جو دوسروں کو راستہ بتاتا تھا۔ ایک دن خود گر پڑا۔ اور یہ گرنا گویا موت کا پیش خیمہ تھا۔ ان کی صحت بڑی اچھی ہو گئی تھی۔ میں خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ وہ ہم سے بچھڑنے والے ہیں۔ اور انہیں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وفات سے ایک دن پہلے میں ہسپتال میں انہیں دیکھنے گیا۔ تمام عزیز و اقارب وہاں جمع تھے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کچھ باتیں کر رہے تھے۔ مگر سب کے رنگ فق اور چہرے اُترے ہوئے تھے۔ اختر جعفری برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اور سب سے زیادہ پریشاں نظر آتے تھے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے فرمایا۔ آؤ اندر چلیں۔ مگر باوجود خواہش کے میں نے انکار کر دیا۔ میں کسی بھی شخص کو ہسپتال میں نہیں دیکھ سکتا۔ خوف آتا ہے کہ نہ معلوم اس شخص کی کتنی زندگی باقی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ موت کا فرشتہ دبے پاؤں اس کے قریب آ چکا ہوں۔ اور بڑی چالاکی سے اپنا سرد ہاتھ بڑھا رہا ہو۔ اور خود مریض بھی تو دل شکستہ اور دو کشتیوں میں سوار ہوتا ہے۔ کبھی موت کا اندھیرا اور کبھی زندگی کی روشنی۔ نہ معلوم کونسی منزل ہو۔ ہم دونوں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ آج باتیں کرنے والا اختر خاموش تھا۔ نظریں دور کہیں خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا۔ کہ ہو سکتا ہے یہ آخری بار ملنا ہو۔ اور پھر کبھی نہ مل سکیں۔ یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ایرانی کولر تیزی سے چل رہا تھا۔ برف کی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔ فضا بڑی بوجھل اور سوگوار تھی۔ ضیا جعفری بسترِ مرگ پر پڑے آخری سانس لے رہے تھے۔ سانس کو آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ذبح کئے ہوئے مرغی کی طرح سانس لے رہے تھے۔ قوتِ گویائی ختم ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا کہوں۔ اگر آغا کو تسلی دوں تو کس طور۔ میں اس منظر کو نہیں دیکھ سکا۔ جلدی سے باہر برآمدے میں آ گیا۔ آغا نے پوچھا کہ کیسے ہیں؟ میں نے کہا "بُرے"۔ اور نظریں جھکا لیں۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ کچھ تسلی کے فقرے کہوں۔ مگر زبان ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اور میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ ایک لفظ بھی۔

دوسرے دن صبح سویرے خاطر صاحب آنکلے اور انہوں نے بتایا۔ کہ رات نو بجے ضیاء جعفری کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کا جنازہ دس بجے اٹھے گا۔ میں اس وقت ان کے گھر کی طرف

روانہ ہوگیا۔ ان کا مطب بند اور گھر سوگوار تھا۔ باہر پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ اور لوگ آجا رہے تھے۔ جعفری کسی نہ کسی عزیز سے گلے لگ کر روتے بھی تھے۔ اور کام بھی کرتے تھے۔ کیونکہ گھر کے بڑے ہونے کی حیثیت سے دیگر کام بھی انہیں سرانجام دینے تھے۔ میرا جی بھی چاہتا تھا۔ کہ میں آغا کے گلے مل کر جی بھر کر روؤں۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ ایک نامعلوم سا حجاب ہمارے درمیان رہا۔ وقت گذرتا گیا۔ کچھ لوگ دبی زبان سے جلدی کا تقاضا کر رہے تھے۔ مگر میں چاہتا تھا۔ کہ اور دیر ہو جائے۔ یہ دنیا میں ان کا آخری دن تھا۔ اس گھر میں اس چھت کے نیچے وہ آخری مرتبہ لیٹے تھے۔ پھر لکڑی کے تختے آئے۔ اور صندوق میں ان کو لٹا دیا گیا۔ نعت خوان اکٹھے ہوئے اور سعدی کی غزل بڑی لے سے پڑھنے لگے۔ مستورات بڑے زور شور سے رو رہی تھیں۔ غزل اور ماتم کچھ عجیب سے معلوم ہوئے۔ چند علم لہرائے گئے اور اس دھوم دھام سے ضیاء جعفری کا جنازہ اٹھا۔ ان کے عزیز ادھر ادھر بے ہوش ہو کر گر رہے تھے۔ اور آخر کار اس دنیا کا عظیم مسافر اپنی آخری آرام گاہ تک جا پہنچا۔ ان پر منوں ٹھنڈی مٹی ڈال دی گئی۔ اب وہ کبھی نظر نہ آئیں گے۔ مگر ان کا دیا ہوا درس، ان کا عمل ان کے نام کو زندہ رکھے گا۔

(۳)

میں پہلے کہیں لکھ آیا ہوں۔ کہ ضیاء جعفری نے اپنی زندگی میں سے دوئی کا فرق مٹا دیا تھا۔ آجکل کے مادیت کے دور میں یہ ایسا کارنامہ ہے۔ جو کبھی کبھار ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کا ایک بڑا ثبوت ان تعلقات میں ملتا ہے۔ جو ضیاء جعفری اور اختر جعفری کے درمیان تھے۔ ان میں باپ بیٹے والی بات نہ تھی۔ صبح گھر سے سدھارتے وقت اختر جعفری اپنے والد کی قدم بوسی کرتے۔ اور وہ ان کو بوسہ دیتے۔ بیماری کے زمانے میں جس طرح اختر جعفری نے روپیہ بہایا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس خدمت میں بیگم اختر جعفری بھی برابر کی شریک تھیں۔ وہ کچھ اس طرح الجھی رہیں کہ مہمانوں اور پرسہ دینے والوں کو سنبھالنا ان ہی سے بن پڑا، اور اس کو ہوش ہی کہاں تھا۔ ان کی وفات کے چند یوم کے بعد اختر میرے کمرے میں آئے۔ وہ پہلے ہی کی طرح ویران اور کھوئے کھوئے سے تھے۔ میں نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "کس کے ماں باپ ہمیشہ رہتے ہیں۔ ہمت مت ہارو"۔ مگر میں دھاڑیں مار مار کر

رونے لگے۔ وہ صرف باپ ہی نہیں تھا۔ بلکہ میرا دوست بھی تھا" ضیا جعفری صرف اختر ہی کے دوست نہ تھے۔ بلکہ سارے عالم کا درد انہوں نے اپنے جگر میں لے رکھا تھا۔ ان کا مقولہ یہ تھا۔ "کہ دوسرا شخص چاہے جو کچھ کرے، تم اپنی حد کے اندر رہو۔ اور اگر ہو سکے تو معاف کردو۔ کیونکہ اس سے بڑی "سزا" دنیا میں اور کوئی نہیں" یہ بات انہوں نے کئی بار میرے سامنے دہرائی۔ اور نصیحت فرمائی۔ کہ "اگر اس اصول کو رگِ جان بنالوگے۔ تو کبھی پریشان نہ ہوگے" ان کا خیال تھا۔ کہ دنیاوی زندگی چند روزہ ہے۔ اور وہ انسان بڑا اور عظیم ہے جو اپنے دامن کو بُرے جذبات سے پاک رکھے۔ ایک دن مرجانا ہے۔ پھر خدائے تعالیٰ اچھے اور برے کو الگ کردے گا۔ یقیناً وہ بڑا انصاف کرنے والا اور دلوں کے بھید جاننے والا قادر مطلق ہے۔

(۴)

میں نے آغا مرحوم کو ایک دن بڑے اچھے موڈ میں پایا۔ وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ شوگر کے جان لیوا مرض میں گرفتار تھے۔ اکثر طبیعت علیل رہتی تھی۔ میں اپنے پورے کنبے کے ساتھ ان کی مزاج پرسی کو گیا۔ اختر گھر سے غیر حاضر تھے۔ بیگم جعفری اور آغا مرحوم گھر میں تھے۔ میں نے کہا کہ "آپ کی خبر لینے آئے ہیں۔ سنا ہے کہ آپ کے مزاج ناخوشگوار ہیں" میری بات اور گلابی اردو سن کر مسکرا دیئے۔ وہ بار بار اس فقرے کو دہراتے رہے۔ "اچھا آپ ہماری خبر لینے آئے ہیں" سچ پوچھئے۔ تو میں شرمندہ بھی ہو رہا تھا۔ اور لطف بھی لے رہا تھا۔ ہر موقعہ پر وہ فارسی کا ایک شعر پڑھتے تھے۔ اور اپنی بہو کو بلا کر سناتے تھے۔ اور پھر تشریح بھی فرماتے تھے۔ ان سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔

(۵)

ضیا جعفری صرف زاہد شب زندہ دار نہ تھے۔ بلکہ خوش مذاقی اور لطافت ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ میرے بار بار کے اصرار پر اختر جعفری نے اصل نام نہیں بتایا۔ اور بقول ان کے یہ قصہ آغا مرحوم نے ان کو سنایا تھا۔ کہ نوجوانی کی عمر میں انہوں نے برقعہ پہن کر ایک دودھ والے کو اشارہ کیا۔ جس کی دوکان ان کے محلے میں تھی۔ اور جو آتی جاتی خواتین کے نظارے سے لطف لیا کرتا تھا۔ وہ سمجھا کہ یہ بھی کوئی شامت کی ماری ہے۔ اور جب آغا مرحوم ان کو ایک

ویران جگہ میں لیگئے۔ اور چہرے پر سے نقاب اٹھایا۔ تو اسکی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اور اسنے بری عادت بد سے توبہ کر لی ہوگی۔

(۶)

بیماری کے دوران ایکدن ضیاء جعفری نے فرمایا۔ کہ "میں زندگی کا انجام جانتا ہوں، اس سے گھبراتا نہیں"۔ اور پھر اپنے سب بچوں کو بلایا اور حسرت بھری آواز میں کہا "تو اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ حشر میں ملنا ہوگا"۔ تو اختر سناتے ہیں۔ کہ گھر میں قیامت بپا ہو گئی۔ وہ آہ و بکا کی صدائیں بلند ہوئیں کہ در و دیوار کانپ اٹھے۔ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے ان کی حالت سنبھلی۔ سب سمجھے کہ وہ رُو بصحت ہیں۔ مگر تقدیر ہنس رہی تھی۔ آنے والا وقت پر تول رہا تھا۔ اور وہ ایک دن آگیا۔ جو انہوں نے اپنی جان خدائے بزرگ و برتر کے سپرد کر دی۔ اور ان ہی عزیزوں نے جو ان کی جدائی کے تصور ہی سے ہراسان تھے۔ ان کو نہلا دُھلا کر ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کر دیا۔ انسان کا یہی تو المیہ ہے۔ یہی اس کی ناتمامی کا داغ ہے۔ کہ وہ جس کو چاہتا ہے۔ جس کے بغیر اسے زندگی کا پل بھر بھی بوجھل اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ وہی اس کے ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے مٹی میں چھپا دیا جاتا ہے۔ اختر جعفری نے اس موقعہ پر بڑے صبر اور استقلال کا ثبوت دیا۔ ان جیسا غم کس کو ہوگا۔ مگر دنیاداری کے دوسرے تمام کام بھی سر انجام دیتے رہے۔

انسان مر جاتا ہے۔ مگر اس کے اعمال اور نیکی زندہ رہتی ہے۔

میں جب کبھی اختر جعفری کے گھر جاتا ہوں۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ ابھی دروازہ کھلے گا۔ اور آغا مرحوم نمودار ہوں گے۔ اور پھر کہیں گے۔ "تم میری خبر لینے آئے ہو"۔ اور میرے لڑکے کو خود اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلائیں گے۔ اور اسی طرح فارسی کے شعر پڑھیں گے۔ اور اپنی بہو کو سنائیں گے۔

کاش ایسا ہو سکتا۔

ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس۔

اشکہائے خونیں

دوستو ماتم کرو ہم سے ضیاء جاتا رہا
شاعری کی منزلوں کا رہنما جاتا رہا

شہر کی دولت لٹی اے اہلِ دل فریاد ہے
ہم کہیں کس سے ہمارا آج کیا جاتا رہا

محفلِ شعر و سخن تاریک ہو کر رہ گئی
نور کا مینار تھا، سید ضیاء جاتا رہا

موت نے شبخوں مارا کاروانِ شعر پر
شاعرو۔ رو رو کہ میرِ قافلہ جاتا رہا

آج درویشوں کی دنیا پر اندھیرا چھا گیا
ایک عارف معرفت کی راہ کا جاتا رہا

اب کہاں سوز و گداز قلب کی کیفیتیں
وہ دلوں کی دھڑکنوں کا آشنا جاتا رہا

حافظ و خیام کس کے شعر پر اترائیں گے
فارسی نغمات کا نغمہ سرا جاتا رہا

کون دے گا اب ہمیں قلب و نظر کی مستیاں
میکدہ ویراں ہے پیرِ میکدہ جاتا رہا

اک مسلسل ذوق و شوق اک جاودانی اضطراب
اس کے اٹھ جانے سے سارا سلسلہ جاتا رہا

زندگی کے موڑ پر ہم دل گرفتہ رہ گئے
کاروبارِ شوق کا وہ ولولہ جاتا رہا

عارفانِ راہِ حق کو موت آ سکتی نہیں
وہ فضاؤں میں کہیں کھویا گیا جاتا رہا

کیا خطا سرزد ہوئی ہم سے جو آنکھیں پھیر لیں
عمر بھر کے ساتھ کا سارا صلہ جاتا رہا

ہمدم و دمساز کا جانا قیامت ہو گیا
دوستی کا لطف جینے کا مزا جاتا رہا

اب سراپا درد ہو کر رہ گئی ہے زندگی
زندگی میں زندگی کا حوصلہ جاتا رہا

اس کے اس بے وقت جانے نے ہمیں مارا نذیر
آشنا کو چھوڑ تنہا آشنا جاتا رہا

سید احمد فراز

یادِ یارِ مہربان

چلو کہ خوابِ عدم سے ذرا جگائیں اسے
جو اس کے بعد ہوا حالِ دل سنائیں اسے

نہ جان میں تاب ہی اتنی کہ اس کو یاد کریں
نہ دل میں حوصلہ اتنا کہ بھول جائیں اسے

امیرِ شہر نہ تھا وہ فقیہہ شہر نہ تھا
چلو وہ کچھ ہی سہی اب کہاں سے لائیں اسے

وداعِ یار رلائے کہ مرثیہ کہیئے
مگر یہ دل کا تقاضا غزل سنائیں اسے

فرازؔ لائقِ جنت تھا وہ گلِ خوبی
تبھی تو لے گئیں فردوس کی ہوائیں اسے

کون چھیڑے گا رباعی کا یہاں رنگیں ساز
اب کرے گی شاعری سرحد میں کس شاعر پہ ناز
مصرعہ تاریخ لکھ خاطرؔ بصد عجز و نیاز
رفت از دنیا ضیائے جعفریِ پاک باز

۱۹۷۰

خاطر غزنوی

مجید شاہد

بیادِ ضیاء جعفری

جو بزمِ یاراں میں جانِ جاں تھے حدودِ جاں سے گذر گئے ہیں
دلوں کو آباد کرنے والے دلوں کو برباد کر گئے ہیں
تبسموں کے خنک اُجالے بکھیرتے تھے جو زندگی میں
وہ آج تصویر بن کے آنسو ہماری آنکھوں میں بھر گئے ہیں

سدا جواں قہقہوں کی شادابیاں لبوں پر سجانے والے
کئی نگاہوں سے ہو کے اوجھل، کئی دلوں میں اُتر گئے ہیں
وہ کیا گئے، جیتی جاگتی زندگی کو بے جان کر کے یارو
تھمی تھمی سی ہے وقت کی رو، گذرتے لمحے ٹھہر گئے ہیں

خلافِ معمول اِس ملاقات کا تأثر ہی مختلف تھا
جو آخری بار ملنے آئے تھے اُن سے، باچشمِ تر گئے ہیں
وجودِ ہستی اگر عبارت نہیں ہے سانسوں کے زیر و بم سے
تو پھر جوان فکر و سرخوش و زندہ دِل ضیاء کیسے مر گئے ہیں

مرے ضیاء کے بغیر بزمِ سخن بھی سونی ہے بزمِ دل بھی
تمام احباب چپ ہیں شاہدؔ تمام نغمے بکھر گئے ہیں

رضا ہمدانی

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

نغمہ در پردہ گلو گیر شدہ اے یاران　　تارِ سازِ نفس یار گل افکار شکست
چنگل گرگ اجل برد ز ما یوسفِ ما　　غارتِ جنس وفا گرمیٔ بازار شکست

آشنا شد نگہ بادہ گساراں بخمار　　قدحِ زیست لبالب شد و ساغر بشکست
حیف باشد کہ گلستانِ سخن رفت بباد　　خارِ غم در جگر و قلب سخنور بشکست

عارضِ نورِ ضیاء، حجلۂ خاکی بگرفت　　شمعِ دل گل شد و تاریکیٔ فرقت آمد
مژدہ باد اہلِ وفا داد، مغان فردوس　　در جناں، راہبر و پیرِ طریقت آمد

۱۳۹۰ھ

سنگِ غم والم برسرِ مرتضیٰ رسید　　چوں ساغرِ وصال بدستِ ضیاء رسید
آتش بدامنِ گلِ رنگیں قبا رسید　　از گل زبانِ شعلہ بہ بالِ ہما رسید
آہ و فغانِ اہلِ وفا بر سماء رسید　　چوں ایں خبر بہ حلقۂ اہلِ صفا رسید
سرخیلِ عاشقانِ وفا میرِ کارواں　　از جادۂ فنا بہ جہانِ بقا رسید
تاریک شد بساطِ جہانِ سخنوری　　چون موجِ سیلِ تند بہ شمعِ ضیاء رسید
زیں غصہ لب گزید رضائے وفا شعار　　چوں جامِ مرگ تا لبِ جانِ ضیاء رسید

سید مبارک حسین شاہ عاجزؔ

نوحۂ غم

اے ضیاء درویش کامل. تاجدارِ زندگی
اے عروجِ شاعری. پیکر نگارِ زندگی

اے فقیرِ حق پرست و پاکباز و خوش نوا
موت نے تیرا چراغِ زیست بھی گل کر دیا

اے بہارِ علم و دانش شاعرِ شیریں کلام
چاند تاروں کی طرح روشن رہیگا تیرا نام

ترے دم سے تھا فروزاں بزمِ الفت کا چراغ
تو اگر اخلاق کا دل تھا تو ایمان کا دماغ

اے شناسائے رموز و ترجمانِ زندگی
تجھ سے وابستہ تھی میری داستانِ زندگی

قادری چشتی۔ نیازی سید عالی وقار
ورد تھا دائم ترا لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالفقار

نیک طینت، نیک سیرت. نیک خصلت زندہ دل
تیرے مرنے سے قسم ہے دکھ گیا ہر ایک دل

زندگی تو نے گذاری ہے بڑی عزت کے ساتھ
اب بھی تو آرام فرما سرمدی راحت کے ساتھ

پھول گلشن کے ترے ہیں لالہ زار و سینہ چاک
کیسے گوہر کو چھپایا ہے زمیں نے زیرِ خاک

تیری پُر شفقت دعائیں اور ترا وہ لطف و پیار
دامنِ صبر و سکون کو کر رہے ہیں تار تار

داغِ دل نیرنگ دنیا پہ نہ کیوں خندہ زن؟
کوکبِ علم و ادب ہو۔ زیبِ آغوشِ کفن؟

اشک خوں بہتے ہیں عاجز چشمِ حسرتناک سے
آہِ سوزاں اب نکلتی ہے دلِ صد چاک سے

آہ. اے سید ضیاء روحِ روانِ سوز و ساز
چل بسا سوئے عدم وہ پیکرِ عجز و نیاز

میرِ سخن جاتا رہا

۱۵ رجون ۱۹۷۰ء کو لاہور میں عرس شاہِ جیلان کے موقع پر پڑھی گئی۔

سید حیات جعفری

گلشنِ سرحد کا وہ سروِ چمن جاتا رہا — روپشاور روکہ تیرا بانکپن جاتا رہا
غوثِ اعظم کی مہک سے شہر کو مہکا گیا — غوثِ اعظم کا چراغِ انجمن جاتا رہا
یوں تو پشاور پرانا موتیوں کا شہر ہے — موتیوں کے شہر سے درِّ عدن جاتا رہا
وہ جو اس چوکھٹ پہ سجدہ ریز تھا پچاس سال — اس گھرانے کا پرستارِ کہن جاتا رہا
سینہ کوبان دل تپاں اہلِ نظر کو چھوڑ کر — وہ حسین وہ مہ جبین وہ گلبدن جاتا رہا
چارسو آندھی اندھیری رات ہے جاؤں کہاں — وہ جو تھا شمعِ شبستانِ چمن جاتا رہا
غوثِ اعظم کا چہیتا شاہ فاضل کا غلام — بدرِ محی الدین کا بدرِ چمن جاتا رہا
اک ترے ہونے سے کیا کیا رونقیں تھیں شہر میں — اک ترے جانے سے لطفِ انجمن جاتا رہا
زاہدِ شب زندہ دار و شاعرِ رنگینِ نور — رونقِ سجادہ و بزمِ سخن جاتا رہا
آج کنعانِ پشاور کس قدر ویران ہے — جانِ محفل یوسفِ گل پیرہن جاتا رہا
یوں بظاہر ایک ہی تو گل چمن سے کم ہوا — لیکن ایسا گل کہ سب لطفِ چمن جاتا رہا
جو یہاں ہر سال لاتا تھا عقیدت کے چراغ — وہ ضیائے جعفری میرِ سخن جاتا رہا

لکھ تو لی پر کس کو دکھلاؤں غزل اپنی حیات
وہ فہیمِ شاعری استادِ فن جاتا رہا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعاتِ ضیاء

عرضِ حال

پیش نظر مجموعہ کے پہلے حصہ میں حضرت آغا سید عنایت علی شاہ ضیاء جعفری قادری چشتی نیازی نظامی کے احباب اور تعلقداروں کے تاثرات کا مرقع پیش کیا گیا۔ جس میں آپ کی نظم اور نثر کے ادبی محاسن پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور آپ کی ادبی اور صوفیانہ زندگی پر اظہارِ خیال کے سلسلہ میں آپ کے کمالِ فن اور آپکے بلند تر روحانی مقام کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے اس دوسرے حصہ میں حضرت سید ضیاء جعفریؒ کے "ارشاداتِ عالیہ" کا مختصراً انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اسے درج ذیل عنوانات سے ترتیب دیا گیا ہے۔

۱) حضرت سید ضیاء کے خود نوشت سوانح حیات۔

۲) آپ کا اپنی شاعری پر خود نوشت تبصرہ۔

۳) آپ کے مقالات اور مضامین کا انتخاب۔

۴) آپ کے فارسی۔ اردو کلام کا مختصراً انتخاب۔

اس دوسرے حصہ کو یوں سمجھئے۔ کہ یہ حضرت سید ضیاء جعفریؒ کی اپنی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ جسے ترتیب دینے کی سعادت ہمیں حاصل رہی ہے۔ اور اس طرح یہ حصہ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ جس میں نظم بھی ہے۔ اور نثر بھی۔ امید ہے کہ آپکے اردو۔ فارسی کلام کے الگ الگ دیوان اور آپ کے مقالات کا الگ مجموعہ بھی چھپ کر آپ کی یادگار کے طور باقی رہجائیں گی۔ بظاہر دیکھا جائے۔ تو یہ کام آپ کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچنا چاہیئے تھا لیکن جہاں تک مجھے حضرت سید ضیاء جعفری کے باطنی اور روحانی اشغال اور احوال کا علم ہے وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ

کلام میں بیان کی گئی بعض وہ باتیں جنہیں وہ عام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی زندگی ہی چھپ جائیں۔ اور اس طرح اب یہ سید جعفری کے احباب کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ ان کے افکار کی تابانیوں کو عام کرنے کی کوشش اور اس کا سامان کر دیں۔ سید ضیاء نے فرمایا تھا :-

" ایک گنجِ گرانمایہ ہوں ویرانے میں " اور اگر ہم یہ سمجھیں کہ یہ گنجِ گرانمایہ آپ کا جسم نہیں بلکہ آپ کی روح پر فتوح تھی۔ جس کے لمعات اب بھی آپ کے ارشادات میں ضیاء پاشیاں کر رہی ہیں تو اس سے آپ کے ارشادات کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ اور اس کے مطالعہ کرنے اور اس سے فیض حاصل کرنے کی پیش نظر مجموعہ میں حضرت سید ضیاء کے جن ارشادات گرامی کو شامل کیا گیا ہے ان میں

۱ سب سے پہلا مضمون آپ کے خود نوشت سوانح حیات کا ہے۔ آپ بیتی لکھنا جس قدر آسان کام نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ جن میں تاریکیاں بھی ہوتی ہیں اور روشنیاں بھی، قابلِ ذکر بھی اور ناقابلِ ذکر بھی۔ آپ بیتی لکھتے وقت آدمی کی حیثیت مورخ کی سی بن جاتی ہے۔ اور مورخ کی سب سے بڑی اور اہم تعریف اس کی غیر جانبداری ہوا کرتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے آپ سے غیر جانبدار ہو کر لکھنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ایک شاعر کی آپ بیتی عزیز اور شاہد کی آپ بیتی ہوتی ہے اس میں ذکرِ دوراں کی بجائے ذکرِ جاناں کی فسانہ طرازیاں ہوتی ہیں۔ اور جب شاعر صوفی بھی ہو تو اس میں گلوں کی مہک اور کلیوں کی چٹک کے ساتھ دل کی کھنک کی آمیزش ہو کر مجاز کو حقیقت کی رنگ دینے کی عشوہ بدامن فسوں کاریاں ہوتی ہیں۔ اور اس طرح اپنے ذات کو محود قرار دے کر حُسنِ ازل کے خد و خال کے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی ہے۔ اور میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ آپ حضرت ضیاء کی آپ بیتی پڑھ کر کیا رائے قائم کر سکیں گے۔

۲ اس مجموعہ میں دوسری اہم چیز حضرت ضیاء کا اپنی شاعری پر ان کا اپنا تبصرہ ہے۔ یہ تبصرہ اگرچہ آپ نے ۱۹۳۶ء میں اپنی شاعری پر کیا تھا۔ اور اس سال کے بعد آپ کے سال وفات تک کے گذشتہ ۴۰ سال کے عرصہ میں آپ کی شاعری نے کیا بلحاظ محاسنِ شعری اور کیا بلحاظِ معنی قابلِ ذکر ترقی کی تھی۔ اس لیے خیال ہے۔ کہ اگر آپ اپنی

زندگی کے آخری دنوں میں اپنی شاعری پر تبصرہ فرماتے۔ تو اس کی نوعیت پیش نظر تبصرے یقیناً جامع اور زیادہ معنویت لیے ہوئے ہوتی۔ البتہ آپ کے اس پیش نظر تبصرہ سے یہ اندازہ لگایا جاسکے گا۔ کہ جب آپ کے ۱۹۴۶ء کے زمانہ تک کے افکار کی گُہرباری کا یہ عالم تھا۔ تو اس کے بعد کے ۴۲ سالوں کے دوران حضرت سید ضیاء نے اپنی فکر کی مزید پختگی اور اپنے روحانی منازل تصوف اور سلوک میں مزید عروج اور ترقی کے دوران جو اشعار موزون کیئے ہیں ان کی لفظی اور معنوی خوبیوں کا درجہ کس قدر بلند ہوگا۔ اور ان میں کن اسرار و رموز کی نشاندہی کی گئی ہوگی۔

حضرت سید ضیاء جعفری نے اپنے موزون افکار کے متعلق اپنے قلم سے جو کچھ لکھا ہے عرب علماء کے اس قول کے پیش نظر کہ صَاحِبُ الْبَيْتِ اَدْرٰی بِمَا فِيْهِ۔ "گھر والا ہی گھر کا بھید جانے" اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ اپنی جگہ یہ بات تسلیم شدہ ہے۔ کہ حضرت سید ضیاء ایک صوفی صافی شاعر تھے۔ تصوف کی منزل میں آکر ایک صوفی شاعر کے اشعار اس کے احوال اور قلبی واردات کا ترجمان بن جاتے ہیں۔ اس میں راہ و رسم منزلہا کی نشاندہی کی گئی ہوتی ہے لیکن اشارات اور کنایات میں۔ اور جب اس قسم کا شاعر اپنے اشعار کی تشریح کے لیے خود قلم اٹھائے۔ تو یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس نے اپنے اشاروں اور کنایوں کی عقدہ کشائی کی ہے۔ اور اس سے ایک شاعر کا اپنے افکار سے خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کام ایک شاعر جس اچھے طریقہ سے خود انجام دے سکتا ہے۔ دوسرا کتنا ہی بالغ النظر کیوں نہ ہو، اس خوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن پھر بھی ایک صوفی شاعر کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ راز کی باتیں پوشیدہ رکھنے کی مصلحت کوشیوں کی وجہ سے کچھ کہتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہیں پاتا۔ اور اس سے اس کے کلام کی معنویت دوبالا ہوجاتی ہے۔ حضرت سید ضیاء کے اس خود نوشتہ تبصرہ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے میں آسانی ہوگی۔

۳ اس مجموعہ کے اس حصہ میں سید ضیاء جعفری کے مقالات اور مضامین درج کرنے سے ایک مقصد تو ان کا انداز بیان اور طرز انشاء۔ اور مختلف مضامین کے زیر بحث

عنوانات اور ان کے موضوع کے ہر ایک پہلو پر جس وسعتِ نظر اور جامعیت کے ساتھ انہوں نے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ اسے ملاحظہ میں لانا ہے۔ جس کے ساتھ ہی حضرت سیدی ضیاء کے فکر اور نظر، فلسفہ زندگی۔ اور ادبی صلاحیتوں کے جاننے میں بھی آسانی ہو گی۔ علم کو عقل اور عقل کو روح کی روشنی قرار دیا گیا ہے۔ حضرت سید ضیاء جعفری جن کی روح منور تھی، ان کی ضیاء پاشیاں آپ کے ایک مقالہ :- "اقبال کا تصور موت و حیات"۔ میں جلوہ افروز نظر آجائیں گی۔

۴ سید ضیاء کے متعلق میں نے پیش نظر کتابچے حصہ اول میں اشارہ کیا ہے۔ کہ آپ فطرتاً "جذباتِ وحدت کے مجذوب" تھے۔ اور عالم جذب سے عالم سلوک میں لوٹ کر آئے ہوئے تھے۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ بعض فقیر وہ ہوتے ہیں۔ جو پہلے مجذوب ہوتے ہیں اور بعد میں عالم جذب سے لوٹ کر سالک بن جاتے ہیں بعض وہ ہوتے ہیں۔ جو پہلے سالک ہوتے ہیں اور بعد میں عالم جذب میں جا کر اپنی باقی ماندہ زندگی بیخودی اور سرمستی میں گذارا کرتے ہیں۔ بعض وہ ہوتے ہیں جو اپنی پوری زندگی کے لیے مجذوب رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی اصطلاح میں کامل فقیر وہ ہوتے ہیں۔ جو جذب اور سلوک دونوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ پہلے مجذوب اور بعد میں لوگوں کو فیض پہنچانے کی خاطر سالک بنا دئے گئے ہوتے ہیں۔ اور اگر سالک کو مجذوب بنا دیا گیا ہو، تو اس کا تعلق عالم امر اور عالم تکوین سے مربوط کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ وہ پہلے سالک رہ چکا ہوتا ہے۔ وہ ہماری اور آپ کی دنیا کے متعلق کچھ کہا تو کرتا ہے لیکن چونکہ ایسا کہتے وقت وہ خود عالم ظاہر سے نکلا ہوا۔ اور عالم امر کا بھی فرد ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی باتوں کو اہل ظاہر سمجھ نہیں پاتے، اور علمائے ظاہر ان کے باتوں کو شطحیات کہکر پکارتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں میں سے ایک کا نام سرمد علیہ الرحمۃ تھا۔ وہ پہلے سالک اور بعد میں مجذوب بنا دئے گئے تھے۔ چونکہ وہ پہلے سالک رہ چکے تھے اس لیے فارسی اشعار کہا کرتے تھے، لیکن ایسا کچھ کہتے وقت چونکہ وہ مجذوب تھے اس لئے ظاہر والے ان کی باتیں سمجھ نہیں پاتے تھے، حضرت سید ضیاء جعفری جذب و سلوک دونوں کے راہ و رسم سے واقف تھے، اس اعتبار سے آپ نے اپنے ایک مقالہ میں حضرت

سرمد علیہ الرحمۃ کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ وہ اس ازلی۔ ابدی اور سرمدی محبوب کے عشق کے متوالے مجذوب سرمد کے باطنی احوال کے متعلق ایک واقفِ حال اور محرمِ اسرار کا حرفِ محرمانہ سمجھا جائے گا۔

۵ حضرت سید ضیاء جعفری سلسلہ عالیہ قادریہ کے علاوہ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ نیازیہ سے بھی منسلک تھے اور آپ کا سلسلہ حضرت نیاز بے نیاز علیہ الرحمۃ کے ذریعہ حضرت سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء تک پہنچتا ہے۔ حضرت امیر خسرو جو درگاہِ محبوبِ الٰہی کے بلبلِ ہزار داستان ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے محبوب مرشد کی شانِ اقدس میں "کرم کردی الٰہی زندہ باشی" کہکر درگاہِ احدیت اور صمدیت سے زندگی دوام کی سعادت حاصل کی ہے۔ حضرت امیر خسرو سے حضرت ضیاء کے روحانی تعلق ثابت ہونے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے متعلق حضرت ضیاء نے اپنے ایک مختصر مضمون میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اظہارِ حقیقت بھی ہے۔ اور اظہارِ عقیدت بھی۔ اور ہم نے عقیدت کے یہ پھول اس گلدستہ میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

۶ حضرت سید ضیاء جعفری کا ایک مقالہ وہ ہے۔ جس میں آپنے خان علیین مکان خوشحال خان خٹک کے فارسی اشعار کا ایک مطالعہ پیش کیا ہے۔ خوشحال خان خٹک جس طرح پشتو زبان کے سلطان تھے۔ اسی طرح فارسی زبان کے میدان فصاحت اور بلاغت کے بھی شہسوار تھے۔ حضرت سید ضیاء نے آپکے اشعار گوہر بار کے معنوی خوبیوں کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ ایک ایسا ادبی مطالعہ ہے۔ جس کے ملاحظہ سے ذہن کو تازگی اور روح کو بالیدگی مل سکے گی۔

۷ پشاور شہر گوناگوں خوبیوں کا مرکز رہا ہے۔ آج سے سوا سو سال پہلے ۱۲۷۱ھ میں اس شہر کی چار دیواری کے اندر علم دوست اور ادب پرور اصحاب کی ایک علمی و ادبی انجمن "بزم یاران پشاور" کے نام سے قائم تھی۔ جس کے روح رواں مرزا صفی سلیم کابلی کے نام کے ایک فاضل عالم اور ادیب تھے۔ "بزم یاران پشاور" کا کام "نوادراتِ علمیہ" کی فراہمی، اور سخن آرائی کی محفلوں کا انعقاد تھا۔ حضرت سید ضیاء جعفری کی زندگی کی ابتدائی دنوں میں بھی "پشاور شہر کی ایک گلی" میں اسی قسم کے ایک بزم کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔

جو پھلی پھولی۔ اور بالآخر ایک ادبی انجمن کی شکل میں ابھری تھی سید ضیاء کے بعض احباب نے آپ کی ابتدائی ادبی زندگی کی طرف کچھ اشارے کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے آپ کا ایک مضمون "پشاور کی ایک گلی" پیش نظر مجموعہ میں شامل کر دیا ہے۔ اس سے آپ کے ابتدائی ادبی رجحانات اور مشاغل کا پتہ لگانے میں آسانی ہوگی۔

— ۵ —

پیش نظر حصہ میں حضرت سید ضیا جعفری کے "منظوم کلام" کا جو حصہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے وقت محاسن شعری اور فصاحت و بلاغت اور طرز بیان کے علاوہ اس پیغام کو بھی نظروں میں رکھا جائے گا۔ جس کے اظہار کے لیے آپ نے شعر و شاعری کو وسیلہ بنا دیا ہے" یوں کہیے۔ آپ نے شعر نہیں کہے بلکہ موزوں الفاظ میں کچھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خطاب دل اور دماغ سے بڑھ کر روح سے ہے۔ روح اپنی جگہ ایک نور اور ایک شمع فروزاں ہے۔ اس کے انوار سے دل کے اندھیاروں میں روشنی اور اُجالا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ لوگ جو اپنے سے بڑھ کر دوسروں کے لیے تڑپنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے دل کی پکار ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اپنے دلوں کی شمعیں فروزاں رکھ کر انہیں بجھنے نہ دیں۔ اور اس کی روشنی میں معارف اور حقائق کا ملاحظہ۔ مطالعہ اور مشاہدہ جاری رکھیں اور حقائق کی جستجو منزل تک پہنچنے کے لیے جاری رکھی جائے۔ یہی کچھ عالم حضرت ضیا جعفری کے منظوم افکار کے مفہوم کا ہے۔ آپ دعوت دیتے ہیں کہ دل کے اندھیاروں کی روشنی کا سامان ہونا چاہیئے۔ یہ دعوت آپ نے اپنے اشعار میں اشاروں کنایوں استعاروں اور تلازمات بعیدہ کے استعمال کے ذریعہ دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے مشکل یہ ہے۔ کہ یہ لوگ کھل کر بات نہیں کرتے۔ بات کرتے ہیں تو استعارات تشبیہات اور ان کے تلازمات بعیدہ کے پردوں میں لپٹی لپٹائی ہوئی۔ اس قسم کی باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے غور کرنے اور قند مکرر کی طرح انہیں بار بار پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے ممکن ہے۔ گل و بلبل۔ باغ و بہار۔ شاہد و ساقی۔ مئی و میخانہ۔ چنگ و رباب اور ساز بربط دل۔ اور نواہائے پریشان کے مفہوم تک رسائی حاصل کی جاسکے۔ آپ نے کہا بھی ہے۔

سخن کے پردے میں گنگناتا ہوں، بربطِ دل بجا رہا ہوں\
میں اپنی بیخود نوائیوں میں خودی کے نغمے سنا رہا ہوں

اور یہ بھی دعوت دی ہے۔

اے دل تجھے آئینۂ اسرار کریں
اے جان طرب آ تجھے بیدار کریں

دیکھا جائے تو پیش نظر کتاب کے حصہ اول میں جناب شمیم بھیروی کے مقالہ اور اس دوسرے حصہ میں جناب سید ضیار کے اپنے مضمون "میرا تازہ کلام" میں آپ کے متعدد اردو اور فارسی رباعیات آ گئی ہیں۔ پھر بھی ہم نے آپ کی تالیف صبوحی اور آپ کے غیر مطبوعہ کلام سے آپ کے چند ایک اردو اور فارسی رباعیات، قطعات اور ان کے ساتھ ہی آپ کی چند اردو اور فارسی غزلیں اور نظمیں شامل کر دیئے ہیں۔ تاکہ سید ضیار جعفری کے اس مصرع کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو۔

ضیار، بہ موجۂ مضراب حسن گم شدہ ایم
نوائے ماست کہ از تار تار می خیزد

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت سید ضیار جعفری نے شعر و ادب کے موضوع پر اپنی طویل ادبی زندگی میں بے شمار مقالات اور مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ جو ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپ بھی چکے ہیں۔ اور ان میں بہت سے ریڈیو پاکستان سے نشر بھی ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں آپ نے ایران۔ افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کے فارسی ادب کے ممتاز اور مشاہیر شعرار پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اور جیسا کہ جناب ن۔ م۔ راشد صاحب نے لکھا ہے۔ حضرت سید ضیار نے ساٹھ سے بھی زیادہ فارسی زبان کے شعرار پر اپنی تقریریں ریڈیو پاکستان سے نشر کی تھیں۔ ان تقاریر میں سے اس وقت صرف اٹھارہ تقریروں کے مسودے میرے سامنے ہیں۔ ان میں سے تین تو سرمد۔ امیر خسرو اور خوشحال خان خٹک پر ہیں۔ اور جن کی طرف اس سے پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ اور باقی دوسرے شعرار پر ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی ہیں۔ جن پر نشر کئے جانے کی تاریخیں درج ہیں اور کچھ پر نہیں ہے۔

ان میں سب سے پہلی تقریر حضرت ابوالحسن یمین الدولہ امیر خسرو علیہ الرحمۃ پر ہے۔ جو مؤرخہ ۱۵ر ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء پر نشر کی گئی ہے۔ اور آخری تقریر ۱۸ر فروری سنہ ۱۹۵۴ء کی ہے۔ جو کتاب نیرنگ عشق غنیمت کنجاہی کے متعلق ہے۔ یہ تقاریر ہفتہ وار پروگرام کے طور پر بیا تا گل بیفشانیم کے عنوان سے نشر کی گئی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے مشاہیر شعراء کے علاوہ دوسرے ادبی اور علمی موضوع پر بھی آپ نے تقریریں نشر کی تھیں۔ اور ان سب کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہوگی۔ جن میں سے ساٹھ تقریریں اس خاص موضوع سے متعلق رہی ہوں گی۔

اس وقت اس خاص موضوع پر جن اٹھارہ تقاریر کے مسودے میرے سامنے ہیں۔ وہ درج ذیل ناموں کے گرامی منزلت شعراء کے متعلق درج ذیل تاریخوں کو نشر کی گئی ہیں۔

۱۔	ابوالحسن یمین الدولہ امیر خسرو دہلوی۔	تاریخ نشر	۱۵ر ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء
۲۔	نظیری نیشاپوری۔	؍؍	۳ر نومبر سنہ ۱۹۵۰ء
۳۔	مرزا صائب اصفہانی۔	؍؍	۱۷ر نومبر سنہ ۱۹۵۰ء
۴۔	مولانا محمد طاہر غنی کاشمیری۔	؍؍	یکم دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء
۵۔	ابوطالب کلیم۔	؍؍	۸ر دسمبر سنہ ۱۹۵۰ء
۶۔	خوشحال خان خٹک۔	؍؍	۱۵ر ؍؍ سنہ ۱۹۵۰ء
۷۔	نور العین واقف بٹالوی۔	؍؍	۱۲ر جنوری سنہ ۱۹۵۱ء
۸۔	مرزا عبدالقادر بیدل۔	؍؍	۹ر فروری سنہ ۱۹۵۱ء
۹۔	شیخ علی حزین۔	؍؍	۱۶ر فروری سنہ ۱۹۵۱ء
۱۰۔	حسن دہلوی چشتی۔	؍؍	۱۲ر اپریل سنہ ۱۹۵۱ء
۱۱۔	عرفی شیرازی۔	؍؍	۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۵۴ء
۱۲۔	غنیمت کنجاہی۔	؍؍	۱۸ر فروری سنہ ۱۹۵۴ء
۱۳۔	چندر بھان برہمن لاہوری۔	؍؍	×
۱۴۔	حکیم سنائی غزنوی۔	؍؍	×
۱۵۔	سرمد شہید۔	؍؍	×

۱۶ - خواجہ فرید الدین عطّار ۔ تاریخ نشر ×

۱۷ - علّامی ابوالفضل ابن مبارک ۔ " ×

۱۸ - سراج الدین علی خان آرزو اکبرآبادی ۔ " ×

ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ (عبدالحلیم اثر)

۷۸۶

خودنوشت

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے کہ ابھی بیس سال کا ایک حسین وجمیل نوجوان تھا۔ حُسن وشباب کے سنہرے اور روشن دن۔ دولت وثروت کی فراوانی ایک رئیس کا بیٹا۔ حُسن وجمال کا ایک مہکتا ہوا گلدستہ۔ شعر وادب کا دلدادہ آوارہ مزاج رات دن شاعری کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ اپنے ہم سنوں اور ہمعصروں میں ایک ممتاز حیثیت کا نوجوان شاعر سٹیج پر تحت اللفظ پڑھتا تو شاعروں پر ایک سناٹا طاری ہو جاتا۔ اسی دور کے ایک مرحوم شاعر کا کہنا تھا۔ کہ ضیاءؔ صاحب اگر سیکڑوں میں اچھا لکھتے ہیں۔ تو ہزاروں سے اچھا پڑھتے ہیں۔ یہ والد صاحب قبلہ کی علالت کا دور تھا۔ وہ پولیس کے سابق انسپکٹر تھے۔ انگریزوں سے اچھے مراسم تھے۔ ۱۹۲۵ء ہی میں ابھی دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ ان دنوں میں اپنی والدہ ماجدہ کے ماموں سردار اعجاز حسین خان مرحوم سب انسپکٹر پولیس کے پاس اسلامیہ سکول کوہاٹ میں پڑھ رہا تھا۔ والد مرحوم تعلیم میں میری غفلت کی وجہ سے مجھے جلد ملازم کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ سرٹامکین آئی جی پولیس سے ملاقات کو گئے اور میرے متعلق انہیں کہا۔ آئی جی صاحب نے مجھے ہیڈ کانسٹیبل بھرتی کر لیا۔ اب تو سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ لگا۔ حسن۔ شعر۔ جوانی اور پولیس کی ملازمت۔ یہ شراب دوآتشہ سے سہ آتشہ اور اب چار آتشہ بنی۔ بقولِ مرزا بیدل۔

دامنِ دل کشیدہ ایم ہمہ   خون مستان بہ گردن مینا

اس مستی اور سرشاری کے عالم میں جب آوارگی زوروں پر تھی۔ ہر گام اک نئی بہار اور ہر سانس ایک رومانی ماحول میں گذر رہا تھا۔ میرے خالق اور مالک رحیم وکریم کو

خدا معلوم کونسی ادا پسند آئی۔ مجھ میں تو اللہ تعالیٰ شاہد ہیں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو خالق یا مخلوق کی نظروں میں پسندیدہ کہی جا سکے۔ کریمی اور رحیمی کا دریا جوش میں آیا۔ میرے شکار زبوں کے لیے ایک مست والست درویش کابلی دروازے کے تھانے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ شاید اسی مقصد کے لیے آیا تھا۔ خدائے عزوجل کا بھیجا ہوا یہ طبیب روحانی ایک وارفتگی اور بیخودی کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت رات کے نو بجنے میں کچھ منٹ باقی تھی۔ لائن پولیس میں گنتی کا وقت قریب تھا۔ نو بجے گنتی ہوتی تھی میں تیز تیز قدموں سے پولیس لائن کی جانب بھاگ رہا تھا۔ کہ اچانک میری نظر اس مرد خود آگاہ پر پڑی۔ میں نے قطعی خلافِ عادت اس کمبل پوش کو سلام کیا۔ جس کی دو آنکھیں اس وقت مشعلوں کی طرح روشن تھیں اور جنہیں دیکھ کر میں مجبور ہو چکا تھا۔ بس یہی سلام میرے جنونِ عشق کی ابتدا تھی۔ میں لائن اس حالت میں پہنچا کہ دل و دماغ پر وہ مجذوب چھا چکے تھے۔ گنتی اور کاروبار ضروریہ کے بعد جب بارک میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو نیند ندارد۔ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ ہر آن مشعلوں کی طرح آنکھیں میرے سامنے رہیں۔ وہ مجھ پر کچھ ایسا چھا گئیں۔ کہ پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ میں نے بڑی بڑی حسین و جمیل جوانیاں دیکھی تھیں۔ حور شمائل محبوبوں کے جھرمٹ میں رہا لیکن کسی رنگین جوانی نے میرے دل و دماغ پر ایسا قبضہ نہیں کیا۔ جو اس سر و پا برہنہ مجذوب کی نظر نے کیا۔ یقین فرمایئے میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ مجھے کیا ہو گیا۔ خدا معلوم کس وقت سویا۔ لیکن صبح اٹھتے ہی وہی جان گداز خیال وہی بے پناہ تصور۔ پریڈ سے فارغ ہو کر میں نے شہر کا راستہ لیا اور اس محبوب دل نواز کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ شہر کے ہر کوچہ و بازار کے کئی کئی چکر لگائے آپ خیال فرمائیں۔ ایک بڑے شہر میں ایک ایسے آہوئے رسیدہ مجذوب بے سر و پا جسے صرف ایک نظر دیکھا تھا۔ جس کا نہ نام معلوم تھا نہ ٹھکانہ۔ ڈھونڈنا اگر جنون نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ میری دیوانگی کی ابتدا تھی۔ دل سے یہی صدا آ رہی تھی۔

اے کہ از کوچۂ معشوقۂ ما میگذری
باخبر باش کہ سر میشکند دیوارش

یقین فرمایئے دل کی کشش اور جذبِ صادق کی بدولت ظہر کے بعد انہیں ڈیگری بازار میں پالیا۔

خوب ہست محبت اثری داشتہ باشد
معشوق ز عاشق خبری داشتہ باشد

ایک آدمی کے سر پر روٹیوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا دھرا تھا۔ اور وہ گداگروں کے ہجوم میں روٹیاں بانٹتے چلے جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ تقریباً ۸½ بجے شب تک ساتھ رہا۔ کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ گھڑی دیکھ کر ساڑھے آٹھ بجے گنتی کے لیے بھوکا پیاسا روانہ ہوا۔ گنتی کے بعد مجھے دس بجے سے ایک بجے تک کی پہلی گشت پر جانا تھا۔ تین سپاہی ساتھ تھے۔ آج تو پانچ چھ گھنٹے ان کی معیت میں گذرے۔ میں جیسے نشے میں چور تھا۔ ایک سرمدی کیف چھایا ہوا تھا۔ بیخودی میں قدم بڑھاتا رہا۔ استعداد کی کمی کے باعث آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

جنوں ہم کار آسانے نہ باشد (بیدل)　　چہ دانشہا کہ بریادش ندارم

گشت سے فارغ ہو کر ڈیڑھ بجے کے قریب جب بستر پر لیٹا تو بھی وہی عالم بارک کے سامنے پولیس کا ہاکی گراونڈ ہے جس کے گرداگرد شیشم اور سفیدہ کے سربفلک درخت لگے ہوئے ہیں۔ اب تو ہر درخت کے نیچے کھڑے ہوئے نظر آنے لگے۔ کبھی میرے بہت قریب کبھی دور اُفق کی پہنائیوں میں مسکراتے ہوئے دکھائی دئے۔ نیند غائب ہو چکی تھی۔

نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی　　اب کے کچھ اور ڈھب سے آنکھ لگی

اب تو اُن سے ایک خاص روحانی رابطہ پیدا ہو چکا تھا۔ اور تقریباً دن میں اکثر ان کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے ان کے اثرات اور صفات غالب ہوتے چلے گئے۔ میں اکثر انہیں گھر لے جاتا۔ کسی قسم کا اناج چاول روٹی تو کھاتے نہیں تھے۔ کبھی کباب یا پھل کھا لیتے۔ ورنہ ان کے لیے فالودہ بنایا جاتا۔ یہ پڑھ کر آپ کو حیرت ہو گی کہ وہ اپنی اصطلاح میں فالودہ کسے کہتے تھے۔ مٹی۔ ردی کاغذ اور پسی ہوئی مرچوں میں پانی ڈال کر ایک مرکب بنا لیتے۔ یہ اکثر ان کے لیے میں بنایا کرتا تھا۔ ان کا من بھاتا فالودہ یہ۔ اسے نوش فرماتے۔

سماع کثرت سے سنتے۔ دن رات میں زردے اور پلاؤ کی کئی دیگیں اپنے ہاتھ سے فقراء میں تقسیم کرتے اور خود ایک دانہ بھی نہ کھاتے۔ سماع میں ان کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ رقص کرتے اور لوہے کے دست پناہ سے اپنے ننگے بدن پر ضربیں لگاتے۔

خواجۂ خواجگان سرکار معین الدین چشتی سنجری اجمیری سے کمال درجے کی نسبت تھی۔ باتوں۔باتوں میں ایک دن اپنی نسبت کا ذکر کیا۔ حضور کی نسبت چشتی صابری تھی۔ سچ ہے اتنا مجاہدہ اور جفاکشی صابری نسبت کا خاصا ہے۔ اب یہ نسبت مجھ پر بھی غلبہ پا رہی تھی۔ اور ہمہ وقت کی ایک بیخودی اور سرمستی رہنے لگی۔ اس زمانے میں نماز نہیں پڑھتا تھا۔ وہ بھی نماز نہیں پڑھتے۔ لیکن تصرف نگاہ ارجمند کا کرشمہ دیکھیئے۔ جب راتوں کو میری نیند غائب ہو گئی اور میں سونے کی کوشش کے باوجود سو نہ سکا۔ تو جی میں خیال آیا۔ کہ بیکار جاگنے سے کیا فائدہ کچھ خدائے عزّ وجل کا نام ہی لیا جائے۔ چنانچہ پشاور کی سردیوں میں نل کے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنا۔ بخدائے علیم کیا نماز تھی۔ سراپا حضور۔ سراپا بیہوشی وخود فراموشی۔ بقول حضرت شمس تبریز۔

عجبا دو رکعت است ایں عجبا چہارم است ایں
عجبا چو سورہ خواندم چوں نداشتم زبانے

درِ حق چگونہ کوبم کہ زدست ماند نے دل
دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا زبانے

بخدا خبر ندارم چو نماز می گذارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد کدامے

نماز میں اکثر بے خودی کی حالت میں قبلے سے رخ پھر جاتا۔ جب کیفیت فرو ہوتی تو مشرق مغرب کسی جانب کھڑا ہوتا۔ یا پھر زمین پر کسی جانب بے تاب و تواں پڑا ہوا دکھائی دیتا۔ کوئی وظیفہ تو پڑھنے کو انہوں نے دیا نہ تھا۔ بس جب سجدے میں اسم ذات اللہ اللہ کہنا شروع کرتا۔ تو سارا محلہ جاگ اٹھتا۔ اور میں آسمان پر معلق اللہ اللہ کرتا ہوا اپنے آپ کو محسوس کرتا۔ اس عالم میں آسمانوں پر ارواح مقدسہ یکے بعد دکھائی دیتے جن میں سے بعض کو پہچانتا اور بعض کو نہ جانتا۔ ذکر کے وقت اکثر میرے سر پر قطار در قطار چراغ جلتے ہوئے نظر آتے۔ ہوتے ہوتے جذب وخود فراموشی کا یہ عالم ہو گیا کہ دن بھر قبرستان میں گذارتا۔ اہل قبور خاص توجہ فرماتے۔ اب راتوں کو قبرستان

میں رہتا۔ شہر سے وحشت آتی۔ سر پر بڑے خوبصورت بال تھے جنہیں ہوش کے دنوں میں اکثر سنوارتا۔ ایک شب مسجد میں پنکھے کی رسی سے بالوں کو باندھ دیا۔ اور مستی و جوش میں دیر تک جھولتا رہا۔ آخر بالوں کا گچھا نکل گیا۔ صبح بال منڈوا ڈالے۔ اہل قبور مجسم ہو کر سامنے آتے۔ ایک قبر دوسری قبر کے پاس بھیجتا وہ کچھ اور ہدایتیں دیتے کچھ سمجھ میں آتا اور کچھ بالکل نہ سمجھ سکتا۔ اکثر رات پشاور کے بڑے ولی اللہ قادری نسبت کے بادشاہ حضرت جنیدؒ پشاوری کے مزار پر گذارتا۔ اس زمانے میں یہاں جنگل تھا۔ اس مزار کے علاوہ آبادی نہ تھی مجاور بھی خوف سے رات کو شہر چلے جاتے۔ ٹریننگ ختم کرنے کے بعد میری تبدیلی نوشہرہ کوتوالی میں ہو گئی۔ یہاں بھی رات بھر نماز پڑھتا رہتا۔

کچھ دنوں بعد دریا کے کنارے چوکی نمبر ایک میں تبدیل ہوا۔ چوکی کے قریب ہی گراس فارم تھا۔ دسمبر جنوری کی راتوں کو دریا پر وضو کر کے گھاس میں سوراخ بنا کر داخل ہو جاتا۔ اور نفی اثبات کا ذکر کرتا۔ جب تک ہوش قائم رہتا تو آہستہ آہستہ کرتا۔ لیکن جوں جوں محبت الٰہی کا شعلہ بھڑکتا۔ تو رات کے سناٹے میں دریا کے کنارے میری آواز پار نوشہرہ تک پہنچ جاتی۔ نوشہرہ کے ڈی ایس پی حاجی اکبر علی خان میرے خالو تھے وہ بھی اس مست الست مردِ خود آگاہ کے معتقد تھے۔ اس لیے میرا بیحد احترام کرتے تھے۔ اور مجھ سے ایک گونہ ڈرتے بھی ضرور تھے۔ یہ ڈر ان کی خدا پرستی اور اہلبیت سے محبت کی وجہ سے تھا۔ ورنہ وہ بہت جابر اور سخت گیر پولیس افسر تھے۔ یہ احترام ایک اور وجہ سے بھی تھا۔ ان دنوں ان کے منجھلے لڑکے جن کو ہم بابا گل کہتے ہیں کے پاؤں میں نقص واقع ہو گیا تھا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں اور وہ کافی علاج معالجے کے بعد بھی کسی قدر لنگڑا کر چلتے ہیں۔ ان دنوں ہزارے کے گاؤں جبسی گراں میں ایک مجذوب رہتے تھے جو اکثر برف میں بیٹھے رہتے تھے اور پتھر کوٹتے رہتے تھے۔ دور اور نزدیک سے لوگ ان کی زیارت کو آتے۔ حاجت مندوں اور مریضوں کا تانتا لگا رہتا۔ اور وہ سب لوگوں کو وہی کوٹے ہوئے پتھروں کا چورا دیتے۔ کسی سے کچھ نہ لیتے۔ اس لیے مرجعِ خلائق بن چکے تھے۔ حاجی صاحب اپنے بچے بابا گل کو لیکر ان کی خدمت میں پہنچے۔ تو وہ صاحب کشف درویش دور سے پکارنے لگے۔ میرے پاس کیوں آئے

جاؤ عنایت علی شاہ کے پاس اسے لے جاؤ۔ تیرے اپنے گھر میں فقیر ہے۔ تو میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بات مجھے بعد میں خالہ نے بتائی۔

نوشہرہ ہمیشہ مجذوبوں کا گڑھ رہا ہے۔ یہاں بہت سے صاحب خدمت مجذوب رہتے ہیں۔ یہاں مجذوبوں کے بادشاہ بابا نور گل رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہماری چوکی نمبر کے سامنے ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ کشتی پل کا محافظ۔ ریلوے پل کا محافظ۔ چھاونی شہر اور پار نوشہرہ کا محافظ۔ درویش بابا نور گل کے قدموں ہی میں اپنی خدمات بجالاتے ہیں۔ اور کچھ اور مجذوب بابا نور گل سے روحانی تربیت حاصل کرنے کے لیے آتے جاتے ہیں۔ یقین فرمایئے رات دن یہ مجذوب پولیس چوکی میں میرے پاس آتے اور اکثر میں بھی ان کی تلاش میں رات بھر پھرتا رہتا۔

مجذوبوں کے سرتاج بابا نور گل رحمۃ اللہ علیہ سے مجھے خاص نسبت ہو گئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں میں پہروں ان کے مزار پر بیٹھا رہتا۔ ایک شب دو بجے کے قریب جب میں اس سنسان پہاڑی پر مزار مقدس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ حضرت نے میرے قلب پر ایک خاص توجہ فرمائی جس سے میرا تمام بدن مسخر ہو گیا۔ اور میں سر کے بل قبر مبارک پر لوٹنے لگا۔ استعداد کی کمی کے باعث مجھے اس وقت یوں محسوس ہوا۔ کہ قبر کے اندر سے ایک گلوبند آیا ایک رسی نکل کر میری گردن سے لپٹ گئی ہے۔ اور مجھے قبر میں اندر کھینچ رہی ہے بیخودی کے عالم میں اس قدر زور سے ھو ھو کرتا رہا۔ کہ ہماری پولیس چوکی سے اس وقت جو گشت گذر رہی تھی وہ سمجھے پہاڑی کے دامن میں کسی کو قتل کیا جا رہا ہے۔ وہ آواز کی سمت دوڑتے ہوئے اندھیرے میں انہوں نے مجھے مزار سے کھینچا تو دیکھکر حیران رہ گئے کہ ان کی چوکی کا انچارج ہے۔ وہ میرے حالات سے کسی قدر آگاہ تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً اٹھایا۔ جب میں ہوش میں آیا تو مجھے اپنے ساتھ چوکی تک لے گئے۔

کچھ دنوں کے بعد ایک دن میں نے اس مجذوب کو جن کی یہ آگ لگائی ہوئی تھی۔ نوشہرہ کے چوک میں دیکھا۔ میں نے پوچھا باباجی آپ کہاں پھر رہے ہیں۔ فرمانے لگے میری بھی تبدیلی ہو گئی۔ اب جب تک خدائے تعالیٰ چاہیں گے میں یہاں رہوں گا۔ باباجی رات کو کسی کے ہاں

نہیں ٹھہرتے۔ جاڑے ہوں کہ گرمیاں رات شہر کے باہر ویرانے میں پڑے رہتے۔ نوشہرہ میں ان دنوں ایک مجذوب عبدالغنی کاکاخیسل تھے جو نوجوان تھے اور اکثر ننگے رہتے تھے۔ انہیں میں اکثر کوئی کپڑا اوڑھا کر پولیس چوکی میں لے آتا۔ جو بات بھی ان سے پوچھئے پہلی مرتبہ نہ اور پھر وہی بات دوسری مرتبہ پوچھئے تو ہاں کہتے۔ مثلاً بابا روٹی کھائے گا۔ تو ان کا مختصر جواب تھا نہ، اور دوسری مرتبہ پوچھئے تو فرماتے ہاں۔ کھانا کھا رہے ہیں آپ پوچھئے بابا کھانا کھاؤ گے تو فوراً کہتے نہ۔ اور لطف یہ کہ روٹی کھا رہے ہیں۔ دوسری بار پھر ہاں کہتے۔ آپ مجذوبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہیں مجذوبِ محض کہا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرات صوفیائے کرام اہل اللہ کو چار قسموں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں مجذوب محض۔ سالکِ محض۔ مجذوب سالک۔ سالک مجذوب۔ یہ تمام حضرات مقبول بارگاہ الٰہی اور ولی اللہ ہوتے ہیں۔

مجذوب محض وہ ہیں جو پیدائشی طور پر مجذوب ہوتے ہیں۔ ازل سے ابد تک غرقِ دریائے وحدت ہوتے ہیں۔ حواسِ ظاہر معطل ہو جاتے ہیں۔ اور حواسِ باطن جنہیں فلاسفہ کی اصطلاح میں خمسۂ لطیفہ کہا جاتا ہے وہ بیدار ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ خلق سے بیگانہ اور حق جل مجدہ سے آشنا ہوتے ہیں۔ ان کی روح ہمہ وقت عالمِ مثال میں رہتی ہے۔ (ذاتِ ترابی) یعنی ظاہری جسم سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی استعداد کے مطابق عالمِ مثال میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو آشکار دیکھتے ہیں۔ اور ہمہ وقت اسی میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے غیر معمولی حرکات سکنات بھی عالمِ مثال کے معاملات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس عجیب وغریب واقعات کی برداشت سے عاجز آکر ان کے حرکات وسکنات ظہور میں آتے ہیں۔ کبھی گریہ کبھی خندہ کبھی دوڑنا بھاگنا کبھی خاموشی۔ کبھی بے سروپا مسلسل بولنا سب ظہورِ عالمِ قدس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ میری یہ رباعی تقریباً اسی مفہوم کو لیے ہوئے ہے۔

گہے گریاں گہے خنداں شدم من — گہے چوں آئینہ حیران شدم من
زخود رفتم گہے تا خود رسیدم — گہے پیدا گہے پنہاں شدم من

مجذوب پر تجلیاتِ ذات کا غلبہ ہوتا ہے۔ جو صفات کی چھاننی سے چھن کر نہیں

آتیں اس لیے ان میں چاندنی رات کی ٹھنڈک نہیں ہوتی۔ بلکہ جون جولائی کی دوپہر کی طرح تمازتِ آفتاب میں ہمہ وقت جلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا تعلق عالمِ ملائکہ سے ہوتا ہے۔ ان میں صاحبِ خدمت حضرات ظلِ مقربین ہوتے ہیں۔ جس طرح ملاءِ اعلیٰ میں ملائکہ مقربین مختلف خدمات پر مامور ہیں۔ کوئی پانی برسانے پر مامور ہے تو کوئی رزق کا فرشتہ ہے۔ کوئی رعد و برق پر مامور ہے۔ اور کوئی حفاظت خلق پر متعین ہے۔ اسی طرح صاحبِ خدمت حضرات مختلف شعبوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ کوئی ریلوے کا محافظ۔ کوئی فوج کی کمان کرتا ہے۔ بلکہ فوج کے ہر یونٹ میں محافظ ہوتا ہے۔ کوئی زمین پر قطب باراں ہوتا ہے۔ کوئی شہروں اور دارالخلافوں کا محافظ ہوتا ہے۔ اس فقیر بے نوا کی ملاقات ان میں سے اکثر حضرات سے ہوئی ہے۔ جس کا تذکرہ انشاء اللہ اپنے مقام پر کروں گا۔

سالکِ محض۔ یہ وہ نفوس قدسیہ ہیں۔ جو حقیقت میں عالمِ ربانی ہیں۔ اور سجادۂ سرکارِ دو عالم پر متمکن ہوتے ہیں۔ تمام عمر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں گذار دیتے ہیں۔ ان کا کام مخلوق کے قلوب و نفوس کا تصفیہ اور تزکیہ ہوتا ہے۔ کارِ نبوت ان کے سپرد ہوتا ہے۔ ان میں بھی بعض صاحبِ خدمت ہوتے ہیں۔ اور بہت سے صاحبِ خدمت مجذوب ان کے تحت کام کرتے ہیں۔ چونکہ حضور سرورِ کائنات کے بعد ہر قسم کی نبوت ختم ہو چکی۔ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام اولیائے امت ہی قیامت تک کرتے رہیں گے۔ خدائے تعالیٰ انہیں گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ معصوم نہیں ہوتے۔ محفوظ ضرور ہوتے ہیں۔

سالک مجذوب وہ حضرات کہلاتے ہیں۔ جن کی ابتداء سلوک سے ہوئی لیکن ریاضت اور مجاہدے کے دوران جذب ہو گیا۔ اور مجذوب بن گئے۔ ان کی مجذوبیت کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ مرید میں استعداد کی کمی۔ شیخ کا مرید کو سنبھال نہ سکنا۔ سلسلے کا براہِ راست سرکارِ دو عالم تک نہ پہنچنا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ریاضت اور کثرت مجاہدہ سے حق تعالیٰ اپنے بندے پر رحم فرما کر اسے اس صورت میں بخشش عطا فرماتے ہیں کہ حواس ظاہری معطل کر دیتے ہیں۔ اور حواسِ باطنی بیدار ہو جاتے ہیں۔ اور درویش ہمہ وقت مشاہدۂ ذات میں

غرق ہوتا ہے۔ اس استغراق کے باعث اُسے جذب ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔
چوتھی اعلیٰ اور ارفع قسم مجذوب سالک کی ہے۔ یہ بہت بلند مراتب فقرا ہوتے ہیں۔ جو جذب وسلوک دونوں سمندروں کے شناور ہوتے ہیں۔ بفضلِ الٰہی طرفۃ العین میں مرید کو غرق دریائے توحید کر دیتے ہیں۔ ان پر خاص اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے۔

میں نوشہرہ کے برہنہ مجذوب عبدالغنی کاکاخیل کا ذکر کر رہا تھا۔ آپ نورگل بابا کے مرید خاص طورگل بابا کے مرید ہیں۔ اور اس درجہ فنافی الشیخ تھے۔ کہ ہر شے میں انہیں شیخ ہی کی صورت دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ ہر کسی کو پیار سے پشتو میں طورہ کہتے تھے۔ جب کوئی آتا تو کہتے طورہ راغلے۔ اور جاتے تو کہتے طورہ ئے۔ سچ ہے انہیں جیسے لوگوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

یہ جو صورت ہے مری صورتِ جاناں ہے وہی
وہی نقشہ ہے وہی رنگ ہے ساماں ہے وہی

ایک روز دن کے وقت میں نوشہرہ چوک میں پھر رہا تھا۔ کہ ایک درویش سے ملاقات ہوئی۔ یہ فوج کی وردی زیب تن کئے ہوئے تھے۔ پاؤں میں فل لانگ بوٹ۔ اوپر زانوؤں تک چمڑے کے چمکدار گیلس نہایت خوبصورت برجس پہنے ہوئے سفید نورانی داڑھی سفید ریشم کے لچھوں کی طرح زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی۔ سر پر بھاری خاکی ٹوپ (ہیٹ) پہنے ہوئے کندھے پر کراؤن لگے ہوئے کمربند کے ساتھ تلوار لٹکی ہوئی گلے میں پستول ڈالے ہوئے تھے۔ پیٹی میں وسل لگی ہوئی تھی۔ ساتھ دو ہمعمر نہایت حسین وجمیل خوشپوش لڑکے ایک اور ساتھی درویش کے گلے میں لٹکی ہوئی پانی کی چھاگل اور پشاوری شیشے کی خوبصورت چلم۔ یہ تھے ملاحی ٹولہ اٹک کے نامی گرامی مست وار سید نور بادشاہ بخاری۔ سید سخی سلطان صدرالدین اٹک والے بزرگ کے صاحب سجادہ۔ خوبصورت سُرخ ڈوردل دالی آنکھیں جن سے ہر وقت بادۂ ناب ٹپکتا ہُوا دکھائی دیتا۔ ان خمار آلود آنکھوں میں بادہ سرمدی کا کیف تھا۔ سرخ سفید نورانی بیضوی چہرہ جو جلال وجمال کا آئینہ دار

تھا۔ ہاتھ میں خوبصورت ہنٹر۔ میری آنکھیں انہیں دیکھکر حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دل پر قابو نہیں رہا۔ جھک کر تعظیم بجالایا۔ اور باقی لوگوں کی طرح میں بھی ساتھ ہو گیا۔ انہیں لوگ دائرے کی شکل میں گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ حضرت نور بادشاہ مرحوم کسی معتقد کے مکان پر اُترتے۔ یہ ان کی مستی اور جوبن کا زمانہ تھا۔ اشارہ پاتے ہی ہر گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد دو خوبصورت لڑکے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اور نہایت سریلی آواز میں جامی یا حسن سنجری یا کسی اور صوفی بزرگ کی نعت نہایت دلکش آواز میں پڑھتے۔ حضرت کی سرخ سرخ کٹوروں جیسی آنکھوں سے دریا کی طرح آنسو بہتے۔ یکایک میری طرف متوجہ ہوئے۔ کون ہو۔ میں نے کہا ایک عاجز ناتوان انسان۔ کس نسل سے تعلق رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا۔ سید کہلاتے ہیں۔ فرمایا کس امام کی اولاد ہو۔ میں نے عرض کیا۔ صادق آلِ محمدؐ امام جعفر صادق سے سلسلہ ملتا ہے۔ فرمانے لگے کوئی قطب کی اولاد ہو۔ میں نے عرض کی۔ حضرت آغا سید میر گنج بخش۔ جن کا مزار بالا حصار کابل میں مرجع خلائق ہے۔ فرمایا اچھا سچ مچ سید ہو۔ یک لخت داہنی طرف منہ موڑ کر بلند آواز سے کہا۔ وی (Hello) غریب نواز حضور میں ۷۲ نمبر سے بول رہا ہوں۔ پھر انگریزی میں کہا۔ (Seven Two) حضور کربلا والا نمبر۔ حضور یہ سید ہے۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ کیا نام۔ میں نے کہا عنایت علیشاہ۔ فرمانے لگے حضور نام عنایت علی شاہ ہے۔ پھر فرمانے لگے غریب نواز نے آپ کو قبول فرمایا۔ یکایک کشف کے ذریعے سے فرمانے لگے۔ تمہارا پیر ناراض ہو رہا ہے۔ کہ تم ان کی اجازت کے بغیر میرے پاس کیوں بیٹھے ہو۔ مجھے نرگس کے پھولوں کا ایک گلدستہ دے کر کہا جاؤ میری طرف سے انہیں نذر پیش کرو۔ اور باضابطہ اجازت لیکر آؤ۔ میں جو چوک میں پہنچا۔ تو باباجی وہاں کھڑے تھے اور سچ مچ ناراض ہو رہے تھے۔ میں نے حضرت کی جانب سے گلدستہ پیش کیا۔ اور باقاعدہ اجازت لیکر دوبارہ حاضر ہوا۔ ان دنوں میری طبیعت کا کچھ یہ عالم تھا۔ کہ ہر شب میں سوچتا کہ صبح ہمیشہ کے لیے کسی جانب نکل جاؤنگا لیکن پھر کچھ ایسی صورت بن جاتی یا غلبۂ جنون کچھ کم ہو جاتا اور میں رک جاتا۔

جاڑوں کی دوپہر تھی میں کمبل اوڑھے اپنے خیالات میں گم پولیس چوکی میں بیٹھا ہوا تھا۔

یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور دریا کے کنارے کنارے چل پڑا۔ یہی ارادہ تھا۔ کہ واپس نہیں آؤں گا۔ لیکن میل ڈیڑھ میل چلنے کے بعد یک لخت خیال آیا۔ کہ اوڑھا ہوا کمبل پرایا ہے۔ یہ میرے ایک ساتھی ہیڈ کانسٹیبل کا تھا۔ یہ پرایا مال ہے۔ اس کا جواب قیامت میں دینا پڑیگا۔ چنانچہ میں واپس لوٹا اور پھر یوں ہوا۔ کہ مجھے کسی ضروری کام کے لیے باہر ڈیوٹی پر جانا پڑا۔ اسطرح یہ وقت ٹل گیا۔ میں نوشہرے میں تھا۔ کہ پولیس ٹریننگ سکول (پھلور) کیلئے منتخب ہوا۔ مجھے فوراً پشاور لائن پولیس آنا پڑا۔ ان دنوں پشاور کا ایس پی مسٹر لاتھر تھا۔ یہ ایک سرکش اور بدنام انگریز تھا۔ میں سید صاحب کے بنگلے پر گیا۔ اور میں نے اس کو کہا کہ مجھے فلور نہ بھیجا جائے کیونکہ میں بیمار ہوں اور کام کرنے کے قابل نہیں۔ میرا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔ اس نے مجھے ایک پولیس افسر کا بیٹا سمجھکر اور اپنے خیال میں میرے مستقبل کی بہتری کے لیے مجھے ڈانٹ کر کہا تمہیں فلور جانا پڑے گا۔ یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ میں نے کہا۔ میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا لیکن اس نے میری ایک بات بھی نہ مانی۔ اور ڈاکٹر کو فون پر کہا کہ اسے ضرور فٹ کرنا ہے اور بھیجنا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹری معائنے کے وقت کوئی گھپلا کر دے۔ چنانچہ مجبوراً مجھے سرحد کے باقی جوانوں کے ساتھ فلور جانا پڑا۔ میں اپنے ساتھ ایک نوکر جس کا نام میرا تھا لے گیا تھا۔ فلور میں صوبہ سرحد کے جوانوں کے لیے ۳۲، ۳۳، اور ۳۴ نمبر کے کمرے ہمیشہ کے لیے مخصوص تھے۔ انہی کمروں کی قطار میں دو تین کمرے چھوڑ کر سید عبداللہ شاہ بیابانی کا مزار تھا۔ قلعہ فلور میں ان کا مزار ہندوؤں کا دھرم سالہ سکھوں کا گوردوارہ اور مسلمانوں کی مسجد تھی۔ مستقبل کی کامیابی اور امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے تمام پولیس کے جوان بلا لحاظ مذہب وملت یہاں سجدہ ریز ہوتے۔ سید عبداللہ شاہ بابا بیابانی جیسے ان کے لقب بیابانی سے ظاہر ہے۔ اپنی زندگی میں بہت بڑے مجذوب گذرے ہیں۔ قبر مبارک ایک سجے سجائے کمرے میں واقع تھی جس میں خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے۔ قبر مبارک پر ریشمی غلاف پڑے تھے۔ چھت سے نہایت خوشرنگ جھاڑ اور خوبصورت فانوس لٹکے ہوئے تھے۔ قلعہ فلور دریائے بیاس کے کنارے بنا ہوا ہے۔ اس کے گرداگرد عظیم الشان کھائی ہے۔ جسے سکھوں کے دورِ حکومت میں بیاس کے پانی سے لبریز رکھا جاتا لیکن بعد میں جب اس کی ضرورت نہیں رہی تو وہ خشک پڑی رہتی تھی۔

ہر جمعرات کو صبح سے دوپہر تک کے لیے قلعے کا دروازہ کھلتا اور لوگوں کو زیارت کرنے کی اجازت ملتی۔ زن و مرد کی ٹولیوں کے ساتھ ڈیوٹی والا سپاہی زیارت تک جاتا اور انہیں زیارت کرا کے واپس لاتا تو دوسری ٹولی انتظار میں ہوتی۔ یہ سلسلہ ایک بجے دن تک رہتا۔ اس دن قلعے کے ہر جوان کو مٹھائی ملتی۔

وہاں کے لوگوں میں حضرت عبداللہ شاہ بیابانی کے متعلق ایک عجیب و غریب واقعہ مشہور تھا۔ خدائے تعالےٰ جانتے ہیں کہ واقعہ میں کہاں تک صداقت ہے۔ اولیائے کرام کی زندگی میں ایسے ہزاروں خوارق کا ظہور ہوا ہے۔ اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ شاہ بابا بیاس کے کنارے جنگل میں رہتے تھے۔ اور اپنے کشف و کرامات کے باعث مرجع خلائق تھے۔ ایک بڑھیا عورت جو ہمیشہ خدمت میں رہتی حضور کی اس پر خاص توجہ تھی۔ یہ بڑھیا جو کسی قریبی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اکثر اپنے گھر سے لسی۔ مکھن۔ دودھ وغیرہ لیکر خدمت میں آتی۔ آپ اس کے گھر سے لایا ہوا کھانا بڑی رغبت سے نوش فرماتے۔ پنجاب کا سکھ راجہ رنجیت سنگھ اس زمانے میں فلور کا قلعہ بنوا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بھی بنیادیں کھود کر دیوار اٹھائی جاتی تو راتوں رات دیوار گر جاتی بہت کوشش اور مختلف معماروں کی کارکردگی سے بھی دیوار کھڑی نہ ہو سکی۔ رنجیت سنگھ نے جو اس قلعے کے بنوانے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ اور فوجی نقطۂ نگاہ سے اس دور میں اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ مجبور ہو کر نجومیوں کو بلایا۔ نجومیوں نے اپنے علم کے مطابق بکزبان ہو کر کہا کہ قلعہ کی بنیادیں ایک ایسے نوجوان کے خون کی ضرورت ہے جس کا بیاہ تو ہو چکا ہو لیکن وہ اپنی بیوی کے قریب نہ گیا ہو۔ چنانچہ مہاراجہ نے فوراً ایسے جوان کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے دن اتفاق سے ایک برات ڈھول تاشے بجاتے ہوئے اس طرف سے گذر رہی تھی جہاں قلعہ بنتا تھا۔ سکھ سپاہیوں نے برات کو ٹھہرایا۔ اور دولھا کو پکڑ لیا۔ اور رنجیت سنگھ کے پیش کیا۔ راجہ بہت خوش ہوا۔ اور حکم دیا۔ کہ دولھا کے ماں باپ کو بلایا جائے۔ دولھا کا باپ تو کبھی کا مر چکا تھا۔ دولھا کی بوڑھی ماں کو رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے دولھا کی ماں سے کہا کہ جتنا روپیہ تیرا جی چاہے۔ لے لے۔ زمین جاگیر جو چاہتی ہے وہ بھی دینے کو

تیار ہوں۔ مجھے تمہارا بیٹا چاہیئے۔ ماں کو لوگوں کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ بیٹا کس مقصد کے لیے راجہ کو چاہیئے۔ ماں نے رونا پیٹنا شروع کیا۔ کیونکہ یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ماں کو دو دن کی مہلت دی۔ اور کہا خوب سوچ لو۔ لڑکا تمہیں واپس نہیں دیا جائے گا۔ لیکن دولت جسقدر چاہو لے جاؤ۔

اتفاق دیکھیئے یہ اسی بڑھیا کا نونہال تھا۔ جو سید عبداللہ شاہ کی خدمت میں آیا کرتی تھی اور انہیں کھلاتی پلاتی اور حاضر باش رہتی۔ بڑھیا روتی پیٹتی سیدھی عبداللہ شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اپنی دکھ بھری کہانی سنائی۔ اور کہنے لگی یہ عجیب حال ہے۔ آپ کی برسہا برس کی خدمت کا یہ پھل ملا۔ کہ مجھے نوبیاہتے اکلوتے بیٹے سے اس آخری عمر میں ہاتھ دھونا پڑا۔ کہتے ہیں حضور کو جلال آیا۔ اور حالتِ جذب میں فرمانے لگے۔ جا رات تیرا بیٹا تیرے پاس آجائے گا۔ رات کو حضرت بوڑھیا کے لڑکے کی شکل میں متشکل ہوئے اور لڑکے کو قید سے رہا کر کے خود کوٹھری میں بند ہو گئے۔ دو دن کے بعد جب لڑکے کی ماں نہیں آئی۔ کیونکہ لڑکا تو اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ ماں کا افسردہ چہرہ فرطِ انبساط سے کھِل کھِلا اٹھا۔ دولہن جسے صورتِ حال کا علم ہو چکا تھا اور فرطِ غم سے نڈھال ہو چکی تھی۔ دولھا کے اس طرح اچانک آنے سے سجدۂ شکرانہ بجالائی اور خوشی کے مارے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ اب اس کا لُٹا ہوا سہاگ اسے دوبارہ مل گیا۔ اب راجہ نے مزید انتظار نہیں کیا۔ اور حضرت عبداللہ شاہ بابا کو بڑھیا کا لڑکا سمجھ کر قلعہ کی بنیاد میں شہید کیا گیا۔ اور لاش مبارک پر مٹی ڈال کر بنیاد اٹھائی گئی۔ اب تو سچ مچ قلعہ کی دیوار مضبوطی سے قائم ہو چکی تھی۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ بڑھیا کا بیٹا زندہ ہے اور سید عبداللہ شاہ غائب ہو چکے ہیں۔ اور دیوار کے نیچے سے کرامتوں کا ظہور ہونے لگا۔ بعض لوگوں نے حضرت کو کئی بار قلعے میں چلتے پھرتے دیکھا۔ کئی لوگوں کے خواب میں بھی حضور تشریف لائے اور اپنی قبر مبارک کی نشاندہی فرمائی۔ تو اس مقام کو مخصوص کر کے یہاں پر قبر شریف بنائی گئی۔

اس طرح حضور کی قربانی سے بڑھیا کا لڑکا اسے واپس مل گیا۔ تقریباً اسی مفہوم کو لیے ہوئے فارسی کا ایک عمدہ شعر مجھے یاد آیا۔

تہنیت گوئید رنداں را کہ سنگِ محتسب بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

درحقیقت اہل اللہ دنیا میں ہماری روحانی اور جسمانی حفاظت فرماتے ہیں۔ آنے والی بلاؤں اور مصیبتوں کے لیے ڈھال بن جاتے ہیں۔ رات دن امتِ محمدیہ کے لیے دست بدعا ہوتے ہیں۔ کسی علاقے میں جب وبا پھیلتی ہے۔ مثال کے طور پر ہیضہ ہو جاتا ہے یا طاعون یا وبائی انفلوئنزا وغیرہ اور دھڑا دھڑ لوگ مرنے شروع ہوتے ہیں۔ تو اس وقت تک یہ وبا ختم نہیں ہوتی جب تک صاحب خدمت محافظ کو ہیضہ یا طاعون نہ ہو جائے محافظ ولی اللہ کا برزخ اتنا وسیع ہوتا ہے۔ کہ وہ تمام شہر کا ہیضہ یا طاعون اپنے جسم مادی میں سمیٹ لیتا ہے۔ یا اس مرض سے وہ مرجاتا ہے۔ یا قریب المرگ ہو کر بچ جاتا ہے۔ تو اس ملک سے وبا ختم ہو جاتی ہے۔

آپ یقین فرمایئے قلعہ فلور میں میری حالت ایک طائرِ پر شکستہ کی طرح تھی۔ جو صیاد کے قبضے میں ہو۔ قلعے کا ڈسپلن اوقات کی پابندی۔ مقررہ اوقات میں سکول جانا۔ علی الصبح پریڈ۔ پی ٹی فٹنگ۔ پھر رات کو مطالعہ کرنا۔ مجھ از خود رفتہ سر مست و سرشار آہوئے رمیدہ خو کے لیے یہ پابندیاں قیامت سے کم نہیں تھیں۔

صلاحِ کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

پریڈ میں یہ حالت ہوتی تھی۔ کہ مارچ کرتے ہوئے جب ڈرل انسٹرکٹر اباؤٹ ٹرن کہتا تو میری آنکھیں بند ہوتیں۔ اور میں اللہ اللہ کہتے کہتے دس بیس قدم آگے بڑھ جاتا۔ اور انسٹرکٹر جو ایک پٹھان تھا۔ سید اور ہم وطن جان کر مری عزت کرتا تھا مجھے کہتا شاہ جی یہ کام کیسے چلے گا۔ آپ کانوں سے بہرے تو نہیں ہیں۔ تو پھر کیوں آپ میرے کاشن کی آواز نہیں سنتے۔ میں کہتا کہ استاد جی میرا اختیار نہیں ہے۔ تو وہ متاثر ہوتا اور مجھے تسلی دیتا آپ ہوش میں رہنے کی کوشش کریں۔ ادھر حضرت عبداللہ شاہ بیابانی کی ہمہ وقتی توجہ کا یہ عالم تھا کہ رہے سہے ہوش بھی جاتے رہے۔ میں فرصت کے اوقات میں اکثر مزار اقدس پر مراقب رہتا۔ حضور مختلف شکلوں میں میرے سامنے آتے۔ کبھی دیکھتا کہ ایک معصوم بچے کی طرح پنگوڑے میں جھول رہے ہیں۔ کبھی قرآن مجید کھولے ہوئے پڑھ رہے ہیں۔ کبھی کمبل

اوڑھے ہوئے مست والست میرے مجذوب بابا کی صورت میں نمودار ہیں۔ کبھی باشریعت ایک بزرگ سالک کی طرح سامنے بیٹھے توجہ فرما رہے ہیں۔ جب میں وردی پہن کر آئینے میں اپنی شکل دیکھتا تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی۔ میں خدائے تعالیٰ سے دعا کرتا کہ مجھے چودہ سال کا جیل خانہ بخوشی منظور ہے۔ لیکن اس حالت سے مجھے رہائی عطا فرمائی جائے۔ قصہ خوانی میں بھیک مانگوں کا کاسۂ گدائی میرے ہاتھ میں ہو لیکن اس پابندی سے ہر طور گلو خلاصی ہو جائے۔ اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہر قیمت پر یہاں سے نکلنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک شب جب میری نوکری میگزین پر لگی ہوئی تھی۔ اس شب مری حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ مجھے خوب یاد ہے۔ کہ غلبہ حال کے باعث مجھ سے قبلہ کا رُخ بھول گیا۔ میں نے بیخودی کے عالم میں قبلے کی مخالف سمت میں نماز ادا کی۔

میں سجدہ کدھر کرتا ہوں اور کعبہ کدھر ہے۔

بارہ بجے کے قریب میں نماز سے فارغ ہوا۔ تو میں مصمم اِرادہ کر چکا تھا۔ کہ آج شب ہی انشاء اللہ میں یہاں سے رہا ہو جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے خود فراموشی میں ایک بظاہر غلط طریق کار اختیار کیا۔ میں نے سوچا کہ کارتوسوں کا کیس میری کمر بند میں لگا ہوا تھا۔ اسے قلعے کے باہر کھائی میں پھینک دوں۔ کچھ دیر اس کشمکش میں رہا۔ آخر جنونِ عشق خرد پر غالب آیا۔ اور میں نے بسم اللہ کہہ کر کارتوس قلعہ کی دیوار کے دوسری طرف پھینک دے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اب مجھے احساس ہوا کہ قلعہ فلور کے قواعد کے مطابق میں نے کتنا بڑا جرم کیا۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دل مطمئن تھا۔ میں اس قید کے بدلے ہر مصیبت کے لیے تیار تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے ڈے آفیسر سے کہا میرے کارتوس چوری ہو گئے ہیں۔ ڈے آفیسر جو پنجاب کے ایک چست و چالاک سب انسپکٹر تھے۔ بہت سٹپٹائے۔ میرے باقی ساتھیوں سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ بہت دیر تک ادھر ادھر ڈھونڈتے رہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد جب کارتوس نہ مل سکے۔ تو مجھ سے بندوق لے کر مجھے ڈیوٹی سے فارغ کر دیا۔ میں بڑے اطمینان سے بستر پر لیٹ گیا۔ صبح تک سوتا رہا۔ علی الصبح دو جوان تلواریں لیے میرے سرہانے آئے۔ میں

نماز سے فارغ ہو چکا تھا۔ یہ لوگ مجھے اپنے پہرے میں گوارٹر گارڈ لے گئے۔ میری پیٹی، قیصد۔ میرے تین ساتھیوں کو بھی لایا گیا۔ ان کی پیٹیاں بھی قید کر دی گئیں۔ وہ لوگ میری منت خوشامد کرنے لگے کہ ہمیں اس عذاب سے چھڑاؤ۔ تم تو نوکری نہیں کرنا چاہتے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم مطمئن رہو۔ تم پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ بس فقط بورڈ کے سامنے آنے کی دیر ہے۔ چنانچہ شام کے قریب مجھے پہرے والوں کی حفاظت میں بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس عرصے میں کارتوس تلاش کے بعد مل چکے تھے۔ بات در اصل یہ تھی کہ قلعے کی فصیل سے کچھ فاصلے پر ایک دوسری دیوار بھی واقع تھی۔ کارتوس باہر کھائی میں گرنے کی بجائے دونوں دیواروں کے درمیانی فاصلے میں پڑے ہوئے مل گئے۔ اب بورڈ والے یہ سمجھے کہ سنتری ڈیوٹی کے دوران پیشاب کرنے کے لیے اس مقام پر بیٹھا ہوں اور کارتوس مجھ سے گر گئے ہیں۔

اس بورڈ میں قانون پڑھانے والے ایک فرانٹیر کے کاکا خیل انسپکٹر تھے۔ انہیں مجھ سے ہموطن ہونے کی وجہ سے کچھ ہمدردی تھی۔ اور کچھ جان پہچان بھی تھی۔ انہوں نے مجھے لقمہ دیتے ہوئے سوال کیا اچھا تم جو پیشاب کے لیے گئے۔ اور فارغ ہونے کے بعد جب اٹھے تو کارتوس وہیں تم سے گر گئے تھے۔ اور تمہیں بعد میں معلوم ہوا۔ میں نے کہا نہیں جناب یہ کارتوس میں نے خود نوکری سے رہائی حاصل کرنے کے لیے عمداً گرائے تھے۔ میں تو اپنی دانست میں انہیں باہر کھائی میں گرا چکا تھا۔ وہ پھر گرج کر بولے۔ میں جو کہتا ہوں کہ پیشاب کرتے وقت گرے کہ بعد میں گرے۔ وہ مجھے کسی طور پر بچانا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے کئی بار جب یہ بات مکرر سہ کرر کہی کہ میں نے خود عمداً گرائے ہیں۔ تو مجبور ہو کر بورڈ نے میرا یہی بیان قلمبند کیا۔ اور بعد ازاں مجھے پرنسپل جو ہالینڈ نامی ایک انگریز تھا کے سامنے پیش کیا گیا۔

وہ دفتر میں میرا منتظر تھا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ پرنسپل بیان پڑھ کر غصے میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا تم کس حق پر ڈائریکٹ ہیڈ کانسٹبل بھرتی ہوئے تھے۔ میں نے اپنے والد۔ دادا اور چچا کا نام لیا۔ ان کی خدمات کا ذکر کیا۔ تو کہنے لگا۔ کیا وہ لوگ بھی اس طرح کرتے تھے۔ میں نے کہا اگر ان کی حالت بھی میری طرح ہوتی۔ تو وہ بھی یہی کر گزرتے۔ اب اسے یہ شک گذرا۔ کہ مجھے کسی اسٹاف کے افسر سے کوئی خاص ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچی ہے۔ کہنے لگے مجھے سچ سچ بتاؤ تمہیں

اسٹاف کے کسی ممبر سے تکلیف پہنچی ہے۔ کہ تم یوں اپنے مستقبل کو تباہ و برباد کرنے پر اُتر آئے ہو۔ میں اس کا فوراً تدارک کروں گا۔ میں نے کہا ہرگز ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میرا دماغی توازن درست نہیں۔ میں نوکری کے قابل نہیں ہوں میں ہر قیمت پر یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا اچھا تم اسی وقت قلعہ چھوڑ دو۔ میں نے تمہارے کاغذات ایس پی کو پشاور بھیج دیئے ہیں۔ وہی فیصلہ کریں گے۔

میں خدائے تعالےٰ کا شکر بجالایا۔ اور ایسا معلوم ہؤا کہ میرے سر سے ایک عظیم بوجھ اُتر گیا۔

حیف باشد چو تو مرغے و اسیرِ قفسے

رات ہی کو مجھے قلعے کے تمام حساب کتاب بے باک کرنے پڑے کینٹین۔ میس۔ دھوبی حجام سب کو نپٹانا پڑا۔ ایک چھپے ہوئے فارم پر سب بے باکی کے دستخط حاصل کئے۔ نوکر نے سامان باندھا۔ قلعے کے دو محافظوں کے پہرے میں اسٹیشن پہنچا۔ مجھے ریلوے وارنٹ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ کچھ پیسوں کی کمی تھی۔ جوں توں کر کے ٹکٹ خرید لیے گئے۔ اور میں ایک طائرِ خوش الحان کی طرح آزاد فضا میں سانس لینے لگا پشاور پہنچ کر دو تین روز تو پولیس لائن نہیں گیا۔ چوتھے روز جب میں ایس ایس پی کے سامنے پیش ہؤا۔ تو اس وقت ریزرو انسپکٹر گل مست خان مرحوم بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ صاحب بولے تم نے یہ کیا کیا۔ میں نے کہا حضور میں تو آپ سے کئی بار کہہ چکا تھا۔ کہ میں فلور جانے کے قابل نہیں۔ انہوں نے کہا اچھا وردی داخل کرو۔ ہم نے تمہیں فارغ کر دیا۔ اب تو میں نے اپنے آپ کو ایک آزاد پنچھی کی طرح فضاؤں میں اڑتا ہؤا محسوس کیا۔ الغرض پولیس کی ملازمت سے میری اس طرح گلو خلاصی ہوئی۔

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست   آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر ظہور

اب اگرچہ میں بظاہر کاروبارِ دنیا سے آزاد ہو چکا تھا لیکن میں عشق کا زیادہ سے زیادہ قیدی بن چکا تھا۔ بقولِ بیدلؒ

چہ دانشہا کہ بر یادش ندارم   جنوں ہم کارِ آسانے نباشد

ہؤا یہ کہ وہ مست و الست مجذوب غائب ہو چکے تھے۔ نہ ان کا کوئی ٹھکانہ نہ وطن کا پتہ نہ کچھ اور نام و نشان۔

در جستجوئے ما نکشی زحمتِ سراغ　　　جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

اب میں حیران و پریشان ان کی تلاشں میں کو بہ کو پھرتا رہا۔

بحر بے تاب کہ آں گوہر نایاب کجاست　　　چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست

دہر زیں غصہ در آتش کہ چہ رنگ است صنم　　　کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

اس سرگشتگی اور وارفتگی میں جنون اور بڑھتا گیا۔ دن گزرتے رہے۔ تلاش یار میں کبھی ویرانے کو نکل جاتا۔ کبھی قبرستان میں دن گذارتا۔ اُن دنوں ایک مجذوب عورت مائی رابعہ جنہیں پشاور والے مائی رابو کہتے تھے۔ پشاور میں پیر عبداللہ شاہ بیابانی کی خانقاہ کے قریب ایک ویرانے میں مقیم تھی۔ بڑی صاحب کشف مجذوب تھی۔ یہ پیر عبداللہ شاہ بیابانی دوسرے بزرگ ہیں۔ قلو ظلور والے نہیں۔ اس کا مزار شاہی باغ کے قریب موجودہ گورنمنٹ کالج کے سامنے ہے۔ آج سے چالیس بیالیس سال قبل یہ علاقہ ویرانہ تھا۔ دن کے وقت بھی یہاں وحشت برستی تھی۔ اس سنسان وادی میں یہ مقبول حق رہتی تھی۔ لوگوں کا ان کے گرد جمگھٹا رہتا تھا۔ بہت زیادہ گالیاں دیتی تھی۔ میں رات گیارہ بارہ بجے کے قریب اکثر ان کی خدمت میں جلانے کی لکڑیاں اور چائے کی چینک لے کر حاضر ہوتا مجھے گالیاں نہیں دیتی۔ آگ جلاتا چائے گرم کر کے پلاتا مجھ پر اپنی گدڑی ڈال کر کہتی۔ "توں جنگی دا پتر ایں۔ آ میرے کول آ" تو جنگی کا بیٹا ہے۔ آ میرے قریب آ۔ ایک دن فرمانے لگیں میرے پاس تو ایک مرغی کا چوزا ہے۔ وہاں دور ایک پٹھان ہے اس کے پاس چوزوں سے بھری ہوئی ٹوکری ہے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ کہ وہ پٹھان درویش شہر کا محافظ ہے۔ اور بڑا صاحب عرفان ہے۔ اتفاق سمجھئے یا ان کا تصرف کہ کچھ دنوں بعد وہ پٹھان فقیر مجھے انہیں کی صحبت میں ملا۔ میں اس مرد حق آگاہ سے ملا۔ اور اکثر ملتا رہا۔ اور الحمدللہ بہت سے فائدے حاصل کئے گئے۔ ہر شے پہ بہار آتی ہے۔ یہ میرے جنون کا موسم بہار تھا۔

مژدہ اے ذوق اسیری کہ بہار است بہار
خرد آشوب تراز جلوۂ یار است بہار

اب یہ جنون اس قدر بڑھ گیا۔ کہ دوستوں سے مطلق ملنا جلنا بند ہو گیا۔ رات اگر آہ و زاری میں گذرتی۔ تو دن بھر بیقراری رہتی۔ جتنا ذکر اللہ کرتا تشنگی بڑھتی جاتی۔ کبھی کبھی وجد

کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تو کپڑے پھاڑ دیتا۔ مجھے شادی کئے ہوئے تقریباً اڑھائی سال ہو گئے تھے۔ ایک لڑکی بھی ماں کی گود میں تھی۔ میں ایک سال تک تو رات اپنے بستر پر بمشکل سویا۔ بستر کیا تھا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے اور دھکتے ہوئے انگارے بن گئے تھے۔ اب تو باہر نکلنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ دن بھر نہ خانے میں رہتا۔ الحمد للہ اس سرگشتگی اور خود فراموشی میں بھی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ دن رات نوافل میں مشغول رہتا لیکن یہ سب کچھ از سر خود کرتا۔ کسی بزرگ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں جو مجذوبوں ہی کے پیچھے پڑا تھا۔ وہ کیا بتاتے۔

آنکس کہ خود گم است کرا رہبری کند

کوئی دوست ملنے آتا۔ تو بڑی تکلیف ہوتی۔ میں کسی کو ملنے کے قابل نہ تھا۔ اور نہ اپنے خلوت کدے سے باہر نکلنے کو جی چاہتا۔

بدگرد باہر کہ در خلوتِ ما زد ۔۔۔۔۔ مارا زسرا پردۂ اسرار برآورد

وہ لذت اور کیفیت اب بھی نہیں بھولتی۔ مولائے روم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست ۔۔۔۔۔ جز بہ خلوتگاہِ حق آرام نیست

ایک روز جنون اس قدر بڑھ گیا۔ کہ آگ کی بھری ہوئی انگیٹھی سے دھکتے ہوئے کوئلے منہ میں ڈال لیے۔ تمام منہ زبان اور ہونٹوں پر چھالے نمودار ہوئے۔ میرے سوتیلے بڑے بھائی میر حیدر شاہ مرحوم جو شغل بادہ و مینا فرماتے تھے نے میری والدہ ماجدہ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو کسی طریقے پر عنایت علی شاہ کو شراب پلائی جائے تو یہ ساری کیفیت دور ہو جائے گی لیکن میری والدہ مرحومہ نے منظور نہیں فرمایا۔ اور نہیں منع کیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات مرحومہ و مغفورہ نے مجھے ایک مدت کے بعد بتائی۔

ان دنوں راتوں کو عام طور پر عجیب و غریب خواب آتے تھے۔ بڑے عالیشان مزارات سبزہ زار۔ شاداب و سرشار کوہسار۔ مصفیٰ اور معطر پانی کی جھیلیں۔ اولیائے کرام اور انبیائے عظام کی زیارتیں ہوتی تھیں۔ رات اکثر خواب میں پرواز کرتا رہتا۔ مصفیٰ جھیلوں سرسبز و شاداب کوہساروں پر اڑتا رہتا۔ کبھی آسمانوں کی سیر ہوتی۔ آسمان کے گوشے گوشے میں ملائکہ کو قیام و رکوع اور سجدے کی حالت میں دیکھتا۔ جب جنون حد سے تجاوز کر گیا تو ایک روز

بھائی صاحب حکیم عبداللہ مرحوم جو اپنے زمانے کے ایک حاذق اور متشرع بزرگ تھے انہیں مجھے دکھانے کے لیے لائے۔ انہوں نے نبض دیکھی حالات دریافت کرتے رہے نسخہ تجویز فرما کر چلے گئے۔ بعد میں دوا نہ میں نے دیکھی نہ پی۔ دن رات یونہی گذر رہے تھے کہ ایک روز آغا غلام رضا شاہ صاحب مرحوم جو میرے کرمفرما اور دوست تھے۔ مجھے دیکھنے کے لیے گھر پر تشریف لائے۔

اس زمانے میں شہر بھر میں مشہور ہو گیا تھا۔ کہ ضیاء دیوانہ ہو گیا ہے۔ آغا غلام رضا شاہ صاحب کے ساتھ میرا بچپن گزرا تھا۔ انہیں میری سرمستی اور رنگینی کی تمام داستانیں یاد تھیں۔ میری جوانی ان کے سامنے گذری تھی۔ وہ برسوں میرے بھائیوں میر حیدر شاہ مرحوم اور نجف علی شاہ کے ساتھ لالہ وزیر محمد مرحوم آغا فقیر شاہ کی معیت میں ہر ہفتے کی شام ہمارے گاؤں ترناب فارم چھٹی کا دن گذارنے پہنچتے تھے۔ اور یہ شب ساز و آہنگ قہقہوں اور حکایات رنگین کے ساتھ گذرتی۔ آغا غلام رضا شاہ مرحوم کے کانوں تک جب میری دیوانگی اور خود فراموشی کے افسانے پہنچے تو آپ مجھے دیکھنے اور تحقیق احوال کے لیے تشریف لائے۔

اس عرصے میں کہ میں قلعہ فلور میں تھا۔ اور میں انہیں نہیں مل سکا۔ وہ ایک مردِ خود آگاہ درویش باصفا سالکِ راہِ صفا سے بیعت ہو چکے تھے۔ ان کی بیعت کا واقعہ جو اپنی نوعیت کا ایک خاص واقعہ ہے۔ کسی اور موقعہ پر بیان کروں گا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آغا صاحب مجھے دیکھنے ہمارے گھر تشریف لائے۔ انہوں نے جب میرے واقعات سُنے کچھ باتیں میرے بھائیوں سے دریافت کیں۔ قلعہ فلور سے بے نیل و مرام ملازمت چھوڑ کر آنا۔ اس صاحبِ حال مجذوب سے میری ملاقات، میرا گہرا لگاؤ۔ دلی رابطہ اور اب اس مجذوب کا پشاور چھوڑ کر چلا جانا اور میری حیرانی و وارفتگی تو یکایک ان کے جی میں خیال آیا کہ میں ضیاء کو کیوں نہ اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں لے جاؤں۔ شاید اُن کے دم درود اور فیض روحانی سے اس کی حالت بدل سکے۔ چنانچہ انہوں نے میری والدہ مرحومہ سے کہا میں اسے یہاں ایک بزرگ آئے ہیں ان کی خدمت میں دم کرانے لے جاتا ہوں۔ میری والدہ مرحومہ اٹھیں آغا صاحب مرحوم کو بہت سی دعائیں دیں۔ اور وہ مجھے ساتھ لے گئے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اس وقت رات کے دس بج چکے ہیں۔ میں اپنے حالات لکھتے لکھتے پھر ایک حسبت میں بیالیس سال پیچھے چلا گیا ہوں۔ وہی سرشاری وہی حیرانی وہی خود رفتگی۔ ابھی اپنے انتظار میں ہوں۔ کہ شاید واپس آؤں تو آگے کچھ لکھ سکوں۔

دیرست بیروں رفتہ ام از اختیارِ خویش
بنشستہ ام اندوہگین در انتظارِ خویش

بڑے دنوں بعد میں باہر نکلا تھا۔ آغا غلام رضا شاہ صاحب میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض کی آنکھوں میں ہمدردی جھلک رہی تھی۔ اور بعض لوگوں کے لیے میں تماشا بنا ہوا تھا۔ یہ مکان جس میں یہ بزرگ مقیم تھے۔ ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ یہ گجرات کے ایک بزرگ ناظر فضل کریم صاحب کا مکان تھا۔ ناظر صاحب اس شکستہ بوسیدہ اور خستہ حال مکان میں کرائے پر رہتے تھے۔ یہ علاقہ سیٹھیوں کا محلہ کہلاتا تھا۔ سیٹھوں کے سر بفلک مکانوں کے پہلو میں یہ ویران گھر عجیب معلوم ہوتا تھا۔ یہ بزرگ اسی مکان میں قیام پذیر تھے۔ یہ ۱۹۲۵ء کے جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ وہ مردِ خود آگاہ ایک بجید گرم بالا خانے میں اس وقت تنہا بیٹھے تھے۔ میں یہاں پہنچا۔ تو مجھے حضرت عثمان مروندی لال شہباز قلندر رح کا یہ شعر یاد آیا۔

تو ہر دم میسرائی نغمہ و ہر بار می رقصم ہر رنگے کہ می رقصانیم اے یار می رقصم

یہ تھے حضرت سائیں رحمۃ اللہ قادری۔ فاضلی بٹالہ شریف کے مشہور و معروف قادریؒ سلسلہ کے سجادہ نشین قبلہ سرکار سید نذر محی الدین قدس سرہ کے خلیفہ مجاز۔ ہم لوگ سلام علیک اور دست بوسی کے بعد دوزانو ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اس زمانے میں حضرت کی داڑھی مبارک سیاہ تھی۔ نہایت سادہ لباس زیبِ تن تھا۔ آغا صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ کہ یہ ایک سید خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اور میرے ان سے اور ان کے بھائیوں سے دیرینہ مراسم ہیں۔ اور اب ان کی یہ حالت ہو چکی ہے۔ جو آپ کے سامنے ہے۔ آپ صاحبِ بصیرت ہیں۔ ان پر توجہ فرمائیں۔ حضرت سائیں صاحب کو کمال درجے کا کشف حاصل تھا۔ آغا غلام رضا صاحب میرے متعلق کچھ مزید فرمانے لگے۔ تو آپ نے فرمایا۔ مجھے معلوم ہے اور پھر اشارتاً کنایۃً

میرے حالات بیان کرنے لگے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

آخر میں فرمانے لگے کہ مجذوب کے ذمے جو کام تھا وہ کر چکا۔ اب اس کا کام ختم ہو گیا ہے۔ میری طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے۔ یہ ایک عالی نسب خاندان کے فرد ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ والدہ زندہ ہے۔ ایک بچی بھی ہے۔ اگر یہ اسی حالت میں چھ ماہ تک اور رہے تو ننگ دھڑنگ قصہ خوانی میں پھر یں گے۔ اور یہ کوئی کمال ولایت نہیں۔ ان کے دماغ کے لطائف ابھی جلے نہیں۔ اگر یہ لطائف جل گئے تو پھر کوئی غوث زمانہ بھی انہیں جذب سے نہیں نکال سکے گا۔ اس وقت اگر یہ کسی باشریعت سالکِ راہِ خدا اور اُسوہ سرکارِ دو عالمؐ پر چلنے والے درویش کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔ تو یہ حالت درست ہو جائے گی۔ اور خدائے تعالیٰ کا ذکر و فکر کرتے ہوئے ہوش میں رہیں گے۔ حالانکہ انہیں میرے حالات کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی۔ وہ پھر فرمانے لگے۔ کہ مجذوب کی مثال آگ کے بھڑکتے شعلے کی طرح ہے۔ جو آگ کے قریب جائیگا۔ اس پر چنگاریاں پڑیں گی۔ دھوئیں سے دم گھٹ جائے گا۔ کپڑے جلیں گے۔ چہرہ جھلس جائے گا۔ اور سالک کی مثال ایک پاک او پاکیزہ بہتے ہوئے دریا کی ہے۔ اس کے کنارے شہر آباد ہونگے۔ سبزہ لہلہائے گا۔ آبادی ہو گی۔ ہرے بھرے کھیت اور باغ اُگ آئیں گے۔ ٹھنڈی ہوائیں اور خوشگوار فضا ہو گی۔

میں چونکہ دل و جان سے اس مجذوب بابا کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ نیز مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ سالک کسے کہتے ہیں۔ اور مجذوب کون ہوتے ہیں۔ نیز فقیر کے متعلق میرا ابتدائی تصور بھی یہی تھا کہ کمبل اوڑھے۔ دھونی رمائے۔ سروپا برہنہ جنگل کے کسی گوشے یا ویرانے میں بیٹھا ہو۔ میں وہاں سے دل شکستہ ہو کر گھر لوٹا اور دل میں انہیں بُرا بھلا کہتا رہا۔ میں ان کے الفاظ کو اپنے مجذوب بابا کی توہین سمجھ رہا تھا اور دل برداشتہ ہو کر وہاں سے آیا۔ پھر وہی روز و شب کی سرگشتگی و حیرانی۔ اس دوران میں دوسری یا تیسری شب میں نے خواب دیکھا کہ لق و دق صحرا میں تلاشِ یار میں پھر رہا ہوں۔ میں نے ایک درویش کو دیکھا جو ایک لمبا کرتہ پہنے ہوئے صحرا کے کسی گوشے سے نکل آیا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ میرا مدعا انہی کی خدمت میں حاصل

ہو گا۔ یہی وہ خضر ہیں۔ جو مجھے چشمۂ حیوان تک پہنچائیں گے۔ میں ان کی جانب بڑھتا ہوا پہنچا اور سلام علیکم کے بعد مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور کچھ کہے بغیر میرا ہاتھ جھٹک کر بھاگ گئے۔ میں بھی ان کو پکڑنے کے لیے دوڑا لیکن وہ غائب ہو چکے تھے۔ میری آنکھ کھلی تو میں زار و قطار رونے لگا۔ جب خوب رو چکنے کے بعد دل ہلکا ہوا۔ تو خواب میں ملنے والے عیسیٰ دوران میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ جب میں نے ذرا غور کیا تو عین ان کی صورت حضرت سائیں صاحب قبلہ سے ملتی ہوئی دکھائی دی۔ اب آتشِ شوق بھڑکی اور جہاں سے میں دل برداشتہ ہو کر آیا تھا دل اسی جانب کھچنے لگا۔ اور دل سے صدائیں آنے لگیں۔

یہ جو صورت ہے تری صورتِ جاناں ہی وہی | وہی نقشہ ہے وہی رنگ ہی ساماں ہی وہی

صبح میں گرتے پڑتے تنہا ان کے دروازے تک کشاں کشاں پہنچا۔

اے پرفشاں چوں بوئے گل نیرنگی از پیراہنت

عنقا شوم تا گردمن یابد سراغ دامنت

ناظر فضل کریم صاحب (مالک مکان) دفتر جا چکے تھے۔ قبلہ سائیں صاحب اسی بالاخانے میں بدستور تنہا بیٹھے تھے۔ میں نے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ حضرت نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اور دوبارہ یہی بات دہرائی کہ آغا صاحب آپ کو کسی سالک سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ تاکہ اس بھڑکتے ہوئے شعلوں کی بجائے جس کی لپیٹ میں آپ آ چکے ہیں۔ چاندنی رات کی ٹھنڈک اور روشنی لے سکیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ یہ باتیں ایسی حالت میں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ویسے بھی میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جو تصوف کو زندقہ اور الحاد سمجھتے ہیں۔ یعنی فرقہ اثنا عشری۔ چنانچہ میں نے سائیں صاحب سے التجا کی کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ اور ان کے حبیبؐ پاک کے ہاں یہ ذمہ داری لیتے ہیں۔ کہ ایسا کرنا میرے لیے بہتر ہے تو آپ ہی ازراہِ کرم میری دستگیری فرمائیں۔ میں اس حالت میں سمجھنے اور سوچنے کے قابل نہیں۔ بہت دیر تک تامل کے بعد فرمانے لگے۔ اچھا جمعۃ المبارک کے دن غسل کر کے آیئے۔ یہ غالباً منگل یا بدھ کا دن تھا۔ ویسے بھی حضرت سائیں صاحب قبلہ بیعت لینے میں تعجیل

نہیں فرماتے تھے۔ ہمیشہ بیعت کی استدعا کرنے والوں کو کم از کم ایک ہفتے کی مہلت دیتے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر سلسلے میں داخل ہو جائے۔ جب میں گھر واپس آیا۔ تو یہ تین چار دن میں نے بڑی بیقراری میں گذارے۔ ایک صبح کا ذکر ہے کہ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو بے اختیار میری زبان پہ میراں میراں جاری تھا۔ اس نام پاک کے لینے سے ایک غیر معمولی لذت اور ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ یہ حضرت سائیں صاحب کا تصرف تھا۔

ان دنوں درود شریف پر قلب اس طرح جاری تھا کہ بازار میں چلتے چلتے بھی بے اختیار درود شریف پڑھتا رہتا۔ ہونٹ اس شیرینی کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت جنبش میں رہتے زبان بے اختیار جاری رہتی کسی سے بات کرتے یا کسی مجلس میں بیٹھے ہوئے بھی یہی عالم تھا۔ خدا خدا کر کے جمعہ کا دن آیا۔ اور میں حضرت سائیں صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ اور انہوں نے ازراہِ شفقت مجھے سلسلہ عالیہ قادریہ فاضلیہ میں داخل فرمایا۔ بیعت کے وقت سے ہی میرے قلب میں ایک روشنی اور ٹھنڈک پیدا ہوئی اور جذب و بیقراری میں ایک نمایاں سکون پیدا ہوا۔ اب جو شیخ کی صورت پر نظر پڑی۔ تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ جگر مراد آبادی نے کیا خوب فرمایا۔

جلوہ بقدرِ ظرف نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے

یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے صحراؤں کے ویرانوں میں بھٹکنے کے بعد آج منزلِ مراد تک پہنچا۔

(نسبتِ غوثیہ) زباں پہ بارے الٰہی یہ کس کا نام آیا
کہ مری نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اب قادری نسبت کے سوتے دل سے پھوٹنے لگے۔ رگ رگ سے یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ کی آوازیں آنے لگیں۔

گرچہ بے ننگ ہوں بے نام ہوں شیئاً للہ
آپ کا بندۂ بے دام ہوں شیئاً للہ

فضاؤں میں یا غوث یا غوث کی آوازیں گونجنے لگیں۔ درود قادری۔ درود ہزارہ اور پنج گنج کا وظیفہ قبلہ سائیں صاحب نے عنایت فرمایا۔ ساتھ ہی مراقبہ

تصورِ شیخ و نفی اثبات کا شغل عطا فرمایا۔ اب چاروں طرف ٹھنڈک ہی ٹھنڈک۔ چاند ہی چاند اور روشنی ہی روشنی۔

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے ۔۔۔ ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

نماز تہجد کی تلقین فرمائی۔ اور بعد از نمازِ تہجد ذکرِ جہر کے لیے ارشاد فرمایا۔ شیخ کامل کے فیض سے نسبت غوثیہ کا ایسا غلبہ ہُوا کہ بقولِ بیدل۔

تا گشت بر حدیث لبت آشنا لبم ۔۔۔ چوں ساغر نگہ زنجیر لبا لبم

نام ترا کہ گوہر مقصود مدعاست ۔۔۔ بگرفتہ چون صدف بدُ دست دعا لبم

بیعت کے بعد دوسری یا تیسری شب خواب دیکھتا ہوں۔ کہ بیت اللہ شریف کے اندر نمازِ تہجد گذار رہا ہوں۔ بعد از فراغت طواف کرتا ہوں۔ دورانِ طواف یکایک سید الکونین رسول الثقلین سرور عالم ﷺ کے روضۂ اقدس پر نظر پڑتی ہے۔ روضے شریف کی جالی کو والہانہ انداز میں آنکھوں سے لگاتا ہوں۔ صلوٰۃ وسلام کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ آنکھ کھل جاتی ہے۔ درود شریف اُسی طرح لب پر جاری ہوتا ہے۔ صبح قبلہ سائیں صاحب سے ذکر کرتا ہوں تو آپ مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ سب شیخ کا کرم تھا۔ میں قدموں پر گر جاتا ہوں۔ شیخ کے متعلق مولائے روم فرماتے ہیں۔

شمس تبریزی کہ نور مطلقست ۔۔۔ آفتاب است وز انوار حقیست

چوں حدیث روئے شمس الدین رسید ۔۔۔ شمس چارم آسماں رو در کشید

واجب آمد آنکہ ہر دم نام او ۔۔۔ شرح کردن رمزے از انعام او

ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

شمس تبریز طلوعی بکن از مشرق جان ۔۔۔ کہ چو خورشید تو جانی و جہان جملہ بدن

اور جب نسبت شیخ اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ تو والہانہ انداز میں فرماتے ہیں۔

پیر من و مرید من۔ درد من و دوائے من ۔۔۔ فاش بگویم ایں سخن شمس من و خدائے من

اسوقت مجھے شیخ شہاب الدین سہروردی کا ایک قول یاد آیا۔ میں بغداد شریف میں ان کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہوں۔ عجیب فیض بخش دربار ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"شیخ مرید کے لیے بمنزلہ ایک صورت ہے جس کے پیچھے مطالباتِ الٰہی و مرضیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے ہیں۔ شیخ ایک دروازہ کی مانند ہے۔ جسے اللہ تعالےٰ نے اپنے آستانۂ کرم کی طرف واکیا ہے۔ اسی میں مرید داخل ہوتا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور شیخ ہی کے ساتھ اس کی واردات اور دینی دنیاوی مہمات نازل ہوتی ہیں۔ مرید کے لیے شیخ اسی طرح امین الہام ہے۔ جس طرح جبرائیل امینِ وحی ہیں۔ پس جس طرح جبرائیل وحی میں خیانت نہیں کرتے۔ اسی طرح شیخ بھی الہام میں خیانت نہیں کرتے"۔

اب قربِ شیخ کامل اور تصرفِ غوثیہ سے ایک کیف و سرور کا دریا امنڈنے لگا۔ ہمہ وقت ایک نشاط و بہجت۔ ایک گنگناتے ہوئے جوئبار کی طرح صوتِ سرمدی کی دلکش آواز ہمہ وقت وارفتگی، ہمہ وقت ایک نشہ دل وجد میں جھوم رہا ہے۔ تو لبوں پر ذکرِ حبیبؐ جاری ہے۔ میری یہ رباعی اسی مفہوم کو لیے ہوئے ہے۔

یہ جنبشِ دل مستئ الہام نہ ہو | یا میکدۂ غیب کا اک جام نہ ہو
اک لرزشِ آواز میری روح میں ہے | شاید یہ ترے وصل کا پیغام نہ ہو

اس کیف و مستی کے بیان سے نوکِ قلم عاجز ہے۔ یہ ویسا ہی ہے۔ کہ سریلی بانسری کے سننے سے یا دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیفیت مجہول ہے۔ احاطۂ بیان سے ماوراء۔

تہجد کی نماز اور نالہ سحری کی کیفیت پر ایک اور رباعی یاد آگئی۔

دل رقص میں ہے۔ جوشِ طرب کیا کہنے | گویا ہے رواں بادہ بہ لب کیا کہنے
اے مستئ الہام سنبھلنے دے مجھے | یہ نغمۂ دل آخرِ شب کیا کہنے

حضرت سائیں صاحب تو تین ماہ کے قریب پشاور رہنے کے بعد ڈبالہ شریف چلے گئے۔ اور میں اہلیہ مرحومہ اور بچی کو لے کر اپنے گاؤں موضع ترناب فارم آگیا۔ اور یہیں رہنے لگا۔ ترناب گل و ثمر کی ایک حسین و جمیل وادی ہے۔ جی ٹی روڈ سے نہر کے کنارے ایک پختہ سڑک ترناب فارم کے بیچوں بیچ ہمارے گھروں تک آتی ہے۔ نہر کے دونوں کناروں

پر نارنگی کے خوشنما درخت لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح پختہ اور صاف شفاف سڑک کے کناروں پر دو رویہ یوکلپٹس۔ دیودار سفیدہ اور ولایتی چنار کے سر بفلک درخت کھڑے ہیں جو ہر آنے والے کا استقبال کرتے ہیں۔ حدِ نظر تک سرسبز و شاداب کھیت ہیں۔ چاروں طرف باغ اُگے ہوئے ہیں۔ یہ نہر ہمارے گھر سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر گذرتی ہے۔ ہمارے گھر ترناب سے کوئی ایک ہزار قدم کے فاصلے پر واقع ہیں۔ بیچ میں نہر حائل ہے۔ یہ ہماری اپنی (گڑھی) موضع ہے جو گڑھی سیدان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ چاروں طرف سے باغات سے ڈھکا ہوا ہے۔ ہمارے مکانوں کی پشت پر ایک فرلانگ کے فاصلے پر دریائے باڑہ بہہ رہا ہے۔ جس میں اکثر برسات کے موسم میں طغیانی آتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی ہماری فصلوں۔ گھروندوں اور مویشیوں کو بہالے جاتی ہے۔ باہر سے آنے والے جب ہمارے حجرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تو سامنے بڑا گیٹ نظر آتا ہے۔ یہی اس فقیر کا غریب خانہ ہے۔ ہمارے دروازے سے چند قدم پر والد صاحب مرحوم و مغفور کی بنائی ہوئی ایک نیم پختہ مسجد واقع تھی۔ جسے میرے بیٹے ڈاکٹر مرتضیٰ جعفری سلمہٗ ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے ۱۹۶۲ء میں باقی عزیزوں اور احباب کے تعاون سے گرا کر پختہ اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ ان دنوں اس مسجد میں ہمارے گاؤں کے نجیب و شریف عالم اور درویش سید صاحب شاہ امام تھے۔ وہ میری محبت کی وجہ سے اپنے گاؤں کی جامع مسجد چھوڑ کر میرے ہاں مقیم تھے۔ کیا اچھے دن تھے۔ روز و شب ذکر و شغل میں گذرتا۔ رات کو دو تین گھنٹے سے زیادہ کبھی نہیں سویا کرتا۔ اپنے پختہ برج میں تہجد کے بعد ذکرِ جہر کرتا۔ تو آواز گونجتی۔ صاحب شاہ صاحب کی نسبت نقشبندی تھی۔ آپ چھپے ہوئے ولی اللہ تھے۔ آپ یقین فرمائیں کہ میں کبھی کبھی ان کی کمر پر مالش کرتا۔ تو پسینے سے گلاب کی خوشبو آتی تھی۔ بعد میں موہڑہ شریف کے حضرت مولانا غلام قاسم صاحب نے خلافت بھی عطا فرمائی۔ میں ان کی زندگی میں ہی انہیں خوابوں میں اولیائے کرام کی محفلوں میں دیکھا کرتا۔ درود شریف بہت کثرت سے پڑھتے۔ وہ ہمیشہ سے اس خواہش کا شدت سے اظہار فرمایا کرتے تھے۔ کہ خدائے تعالیٰ ایسا کرم فرمائیں کہ میں اور تو دیارِ حبیب ﷺ جائیں

روضہ اقدس کی جالیوں کے سامنے رو رو کر سلام کے تحفے بھیجیں۔ اور بیت اللہ کی زیارت کریں۔ خدائے تعالیٰ یہ آرزو پوری فرمائیں۔

کچھ عرصے بعد ہم گاؤں چھوڑ کر شہر چلے آئے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کہاں تھا۔ بہر نوع کہیں سفر پر گیا تھا۔ واپسی پر معلوم ہوا۔ کہ صاحب شاہ بادشاہ کا وصال ہو گیا۔ چند دنوں بعد رمضان المبارک کا مہینہ آیا۔ میں خواجہ معروف صاحب کی جامع مسجد میں جو میرے گھر کے قریب ہے۔ معتکف ہو گیا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک سید صاحب عرصے سے رہتے تھے۔ جو عالم۔ درویش اور صائم الدہر تھے۔ نہایت باخدا انسان تھے۔ جب تراویح میں قرآن مجید گیارہ دنوں میں ختم ہو گیا۔ تو بادشاہ صاحب نے رمضان شریف کے آخری دس دنوں میں ایسا انتظام کیا۔ کہ ہم لوگوں نے پانچ دنوں میں دو قرآن مجید بیک وقت سُنے۔ ایک حافظ تسبیح میں سوا سپارہ نماز میں پڑھتا۔ تو دوسرا حافظ وہی سوا سپارہ تسبیح میں بیٹھ کر سناتا۔ سحری کے قریب تراویح کی بیس رکعتیں ختم ہوتیں۔ بمشکل ہم کھانا کھاتے۔ اور فوراً آذان ہو جاتی۔ ختم شریف کے خاتمے کے بعد اب رات کو دو تین گھنٹے سونے کو مل جایا کرتے ان دنوں عجیب عالم تھا۔ یقین فرمائیں جب بھی آنکھ لگی۔ صاحب شاہ بادشاہ کو تراویح میں قرآن سناتے دیکھتا۔ ان کے پیچھے مقتدیین کی ایک بڑی جماعت کھڑی ہوتی۔ جتنے سپارے پڑھتے۔ دوسرے دن آگے سے پڑھتے۔ حتیٰ کہ قرآن شریف ختم ہو گیا۔ حالانکہ وہ حافظِ قرآن نہ تھے۔

اسی اعتکاف کے دنوں میں ایک شب خواب میں دیکھتا ہوں۔ کہ میں اپنے گاؤں والے گھر کی ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوں۔ اس عالم میں صاحب شاہ بادشاہ صاحب تشریف لائے ہیں وہ مجھ سے بے اختیار فرماتے ہیں۔ چلو مدینہ طیبہ چلیں۔ میں ساتھ ہو جاتا ہوں۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ کچھ فاصلہ پیادہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ مدینہ طیبہ پہنچتے ہیں۔ ایک مکان کرائے پر لیتے ہیں۔ پیچھے ایک مزدور سامان لے کر آتا ہے۔ مکان میں چارپائیاں پڑی ہیں۔ سامان چارپائی پر رکھ دیا جاتا ہے۔ میں اس فکر میں ہوں کہ دروازے کو تالا لگا کر روضہ اطہر کی زیارت سے مشرف ہوتے جائیں۔ بادشاہ صاحب فرماتے ہیں۔ تالا والا چھوڑ دو۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔

جلدی کرو زیارت کر آئیں۔ کہیں مر نہ جائیں۔ ہم مکان کا دروازہ کھلا چھوڑ کر روضہ اطہر پر حاضر ہوتے ہیں۔ سلام و درود کے بعد میرے دل میں فوراً ایک بات آتی ہے۔ کہ سعدی شیرازیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ برسوں روضہ اقدس کو اپنی داڑھی مبارک سے جھاڑتے رہے۔ تمہاری داڑھی نہیں تو کیا ہُوا۔ چنانچہ میں والہانہ انداز میں اپنے چہرے کو روضۂ اطہر پر ملتا ہوں۔ اور گرد مبارک کو جھاڑتا ہوں۔ یہاں سے ہم بیت اللہ شریف پہنچ جاتے ہیں۔ اور حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر واپس لوٹتے ہیں۔ بادشاہ صاحب نے بدستور میرا ہاتھ تھاما ہُوا ہے۔ اب ہم بادشاہ صاحب کے جدِ امجد کے مزار پر پہنچ جاتے ہیں۔ مصطفےٰ شاہ بابارح۔ آپ گاؤں کے باہر ایک چار دیواری میں دفن ہیں۔ اس چار دیواری میں بادشاہ صاحب کی قبر مبارک بھی واقع ہے۔ بادشاہ صاحب کے جد امجد کا نام مصطفےٰ شاہ بابا ہے۔ اور اسی نام پر یہ مزار اقدس مشہور ہے۔

یہاں کچھ لوگ مسجد میں بیٹھے ہیں۔ عصر کی آذان ہو چکی ہے۔ بادشاہ صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔ بادشاہ صاحب آگے بڑھ کر امامت کا فرض ادا کرتے ہیں۔ بعد از فراغتِ نماز میری آنکھیں کھلتی ہیں۔ یہ مقام ہے ایک مردِ خدا کا جو موت کے بعد بھی اپنے ایک محب کو ایک آن میں بیت اللہ پہنچا سکتے ہیں۔ اور روضہ اطہر کی زیارت سے فیضیاب کرتے ہیں۔

چہ گویمت کہ بہ مے خانہ دوش مست و خراب

سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہ ہا داد ست

اس ذوق و شوق میں دن گذرتے رہے۔ جب دن کے اُجالے سو جاتے ہیں۔ اور رات کی تاریکیاں جاگ اُٹھتیں ہیں۔ تو آتشِ دل بھی بھڑک اُٹھتا۔ بستر دھکتے ہوئے انگارے کی طرح لگتا۔ اس عالم میں ذکر و فکر کے ساتھ ساتھ اکثر بے اختیار شعر کہنے لگتا۔ میں نے اس علم کو بہت جان کاوی سے سیکھا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں میں یکساں دسترس حاصل تھی۔ اس زمانے میں بجلی ہمارے شہر میں نہیں آئی تھی۔ موم بتی روشن کرتا۔ اپنے صوبے میں پہلا رباعی گو تھا۔ جس زمانے میں میں رباعی کہتا تھا۔ اس کے صحیح مفہوم کو بھی کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ رباعی میں بھی غزل کی طرح ساغر و مینا کے پردے میں دل کی واردات بیان کرتا۔

بقولِ غالب

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

چنانچہ بے اختیار بول اٹھتا۔

ہے صبح براگندہ نقاب اے ساقی
ہے وقت کہ ہوں غرق شراب اے ساقی
آ مثل سحر روح کو بیدار کریں
ہے قصہ گیتی ہمہ خواب اے ساقی

یا پھر یوں گویا ہوتا۔

بتخانے سے ہے آج حرم تک مستی
میخانے میں ہے جام سے جم تک مستی
کیا سلسلۂ کیف ہے اللہ اللہ
یوں دست بدست آئی ہے ہم تک مستی

اے دل ماہ تمام ہونا ہے تجھے
صورت گر صبح و شام ہونا ہے تجھے
ہمدردی انسان کا آنسو بن کر
اس تیرہ شبی میں جام ہونا ہے تجھے

اور کبھی کیف و سرخوشی اور انتہائے مستی میں گنگناتا۔

ساقی کو ہے سجدہ کبھی ساغر کو سلام
مستوں کی نمازیں نہ قعود اور نہ قیام
میخانے کی چوکھٹ پہ نماز مستی
حق حق میں صراحی ہے تو ہو ہو میں ہے جام

سچ پوچھئے تو یہی شعر و شاعری ایک درد لا دوا بن کر رہ گیا۔ اور خدا کے راستے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئی۔ شعر اپنے لیے ایک ماحول چاہتا ہے۔ جہاں اسے سمجھا جائے سنا جائے۔ داد دی جائے۔

یہی ماحول راہِ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ اس طبقے کی اکثریت خدائے عزوجل سے غافل ہے۔ ان کی شبانہ روز صحبتوں میں سوائے ظلمت کے کوئی حاصل نہیں تھا۔ انہی شعرائے کرام میں کمال درجے کے اولیاء اللہ بھی گذرے ہیں۔ میں تو آج کی بات کر رہا ہوں۔ جب کہ ترقی پسندی دہریت اور جنسی بھوک کا بھوت ان پر سوار ہے۔ یہ تو سرکار جیلانی کا تصرف تھا۔ شیخ کامل کی نظر تھی۔ کہ میں اس قعر دریا میں بھی دامن بچاتا رہا۔ الحمد للہ علی التوفیق۔ اس کی ایک وجہ حضرت شیخ الحدیث مولانا گل فقیر احمد چشتی قادری

خطیب جامع مسجد مولٰنا نصیر احمد صاحب کی صحبت بابرکت تھی۔ آپ اعلٰحضرت سید مہر علی شاہ گولڑوی رح کے خلیفہ تھے۔ توحیدِ وجودی میں آپ کا بہت بلند مذاق تھا۔ بلند مرتبہ عالِم۔ صوفی درویش اور مردِ خود آگاہ تھے۔ خدائے تعالٰی مغفرت فرمائے۔ آپ برسہا برس تک نمازِ شام کے بعد عشار تک قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ اس درس کی ایک عجیب کیفیت تھی۔ درس کیا تھا۔ حقائق ومعارف کا امنڈتا ہُوا دریا۔ یہاں میں برسوں حاضر ہوتا رہا۔ درس حدیث میں حضرت عجیب عجیب نکات بیان فرماتے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ پشاور میں آپ کے بعد صوفیانہ مذاق کی تعلیمات کا خاتمہ ہو گیا۔ صحاحِ ستہ میں نے حضور ہی کی خدمت میں پڑھی۔ اس کے بعد پھر قرآن مجید کا درس شروع ہوا۔ جس میں اکثر حاضر ہوتا۔ اس درس میں اکثر پڑھے لکھے لوگ شامل ہوتے تھے۔ جو ایک مرتبہ آیا۔ وہ پھر اس لذت کو عمر بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ آپ کی ذات ایک ایسے چراغ کی طرح تھی جس کی روشنی قلوب وارواح کو منور کرتی تھی۔ درس کے بعد نماز عشا اول وقت میں ادا فرماتے۔ یہ نماز ایک عجیب بے خودی اور وارفتگی کے عالم میں پڑھی جاتی۔ اس وقت مولانا پر جو تجلّی وارد ہوتی۔ اس کے اثرات بقدرِ استعداد سب پر مرتب ہوتے۔ یوں محسوس ہوتا کہ عالمِ ملکوت کی جانب کھچے جا رہے ہیں۔ بخدا ان کے بعد ایسی نماز پھر میسر نہیں آئی۔

واجب آمد چونکہ ہر دم نا رم او　　　شرح کردن رمزے از انعامِ او

لیکن ان کے فیوضات اور انعامات کی شرح سے قلم عاجز ہے۔ سیکڑوں مفید وکار آمد باتیں جو آج میں نے پلے باندھی ہیں۔ انہی کی قدموں کا صدقہ ہے۔

انہی کے ایک پیر بھائی سید المفسرین مولانا برکت علی صاحب بھی اعلٰحضرت سید مہر علیشاہ صاحب رح کے خلیفہ تھے۔ آپ محکمہ تعلیم میں السنہ شرقیہ کے استاد تھے فاضلِ اجل۔ قرآن مجید کی تفسیر بیان فرماتے وقت یوں لگتا جیسے آپ پر الہام کی بارش ہو رہی ہے۔ انہیں مجھ سے بیحد محبت تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میں کسی صورت ان سے قرآن مجید اور مثنوی مولائے روم پڑھوں۔ لیکن۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ میں

شومیٔ قسمت سے اس کی تکمیل نہیں کر سکا۔ آپ ملازمت کے دوران جہاں کہیں بھی جاتے قرآن مجید کا لنگر جاری رہتا۔ آپ نے قرآن مجید کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کیا تھا۔ ہند و بیرونِ ہند متعدد علماء کی خدمت میں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے وصال کے بعد ان کے زندہ جاوید ہونے کا ایک واقعہ جو مجھ پر گذرا۔ بیان نہ کروں۔ تو اس بیان میں تشنگی رہ جائے گی۔ یہ ایک خواب ہے۔ جو پچھلے برس میں نے دیکھا۔ اگرچہ خوابوں کے لیے اس کتاب میں ایک علیحدہ باب باندھا گیا ہے۔ لیکن یہاں اس خواب کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ تو آپ حضرات کو معلوم ہے کہ حضور سرکارِ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی کے متعلق نور و بشر کا مسئلہ دیوبندی اور بریلوی حضرات میں متنازع فیہ ہے۔ الحمدللہ ہمارا اس گروہ سے تعلق ہے جو سرکار سرورِ کونین کو سراپا نور اور نورٌ مِن نورِ اللہ سمجھنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ حضرت مولٰنا برکت علی مرحوم اس مسئلے کو عجیب و غریب طریقے سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ بعد از وصال بھی آپ یہی تعلیم دیتے تھے۔ خواب میں دیکھتا ہوں۔ کہ میں بیت اللہ شریف کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ مولٰنا مرحوم نہایت نورانی صورت میں سیاہ ریش مبارک۔ سیاہ زلفیں اور جگمگاتی ہوئی پیشانی کے ساتھ سفید براق لباس زیب تن کیے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور کچھ کہے سنے بغیر میرا ہاتھ تھام کر مسجدِ حرام کے صحن سے گذرتے ہوئے دیوارِ کعبہ کے سایہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ کی تفسیر نہایت فصاحت اور بلاغت سے بیان فرماتے ہیں اور مسئلے کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کلام کے خاتمے پر میرا ہاتھ اسی طرح تھامے ہوئے مسجد الحرام سے باہر آتے ہیں۔ اور مجھے رخصت کرتے ہیں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ تو میں دل میں اس خواب کا یہ مطلب لیتا ہوں۔ کہ اس زندہ جاوید ہستی کو ہمارے عقاید کی صحت کا پس از مرگ بھی کس قدر خیال ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آج سے بیالیس سال پیشتر پہلی مرتبہ بٹالہ شریف عرس شاہ جیلان کی تقریب پر جانا ہوا۔ تقریباً سوا دو سو برس سے بڑی گیارھویں شریف کے موقعے پر اس عرس سراپا قدس کو خانقاہِ عالیہ میں بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ سابق پنجاب۔ سرحد اور ہندوستان کے

دور دراز علاقوں سے عاشقان غوث الاعظم اس میں بصد عجز و نیاز شرکت کرتے ہیں۔ یہ مجلس ربیع الثانی کی دس تاریخ کو صبح سات بجے سے دس بجے تک رہتی ہے۔ اس محفل قدس میں بڑے بڑے علماء۔ نعت خوان اور قوال شریک ہوتے ہیں۔ اور بصد نیاز حضور غوث اعظم نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اعلیحضرت صاحب سجادہ صدر مجلس کی حیثیت سے ایک زرنگار مسند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

پشاور سے ہم ایک قافلے کی صورت میں حاضر ہوتے تھے۔ آغا سید غلام رضا شاہ صاحب مرحوم۔ ناظر فضل کریم مرحوم اور جناب عبدالودود قمر ہمارے قافلے میں شامل تھے۔ میرے جگری دوست عبدالودود قمر سلمہٗ جو پہلے اہلِ حدیث طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ فقیر کی وساطت سے اسی سال حضرت سائیں صاحب کے حلقۂ ارادت میں آچکے تھے میں نے پہلی مرتبہ عرس سراپا قدس کے موقع پر حضور شاہ جیلانؓ نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے منقبت پڑھی۔ جسے اعلیحضرت صاحب سجادہ نے بیحد پسند فرمایا۔ پھر ہر سال بڑے اہتمام سے عرس شریف کے موقع پر ایک منقبت پیش کرتا۔ چنانچہ اس سال ۱۹۶۸ء کو اس سلسلے کی بیالیسویں نظم پیش کرچکا ہوں۔ الحمد للہ بقول میر انیس۔ عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔

بٹالہ شریف پہنچکر جب پہلی مرتبہ اعلیحضرت جناب مولانا و مرشدنا سید نذر محی الدین سجادہ نشین دربار قادریہ فاضلیہ پر نظر پڑی۔ تو دل و جان سے والا و شیدا ہوگیا۔

نور مطلق متجلی ز جبین و رخ تو　　　کافر است آن کہ کند منع پرستیدن تو

اعلیحضرت سابق پنجاب اور مشترکہ ہندوستان میں علم و فضل کے درخشان آفتاب تھے۔ اس جگمگاتے سورج کی کرنیں سرحد اور ماورائے سرحد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اعلیحضرت سلسلہ عالیہ فاضلیہ کے آٹھویں سجادہ نشین تھے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت قطب عالم شمس العارفین قدوۃ السالکین سیدنا ابو الفرح سید فاضل الدین عمدۃ الاولاد غوث اعظم بٹالوی تھے۔ حضرت سجادہ عالیہ وقار خلق محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کے نمونے تھے۔ عرس سراپا قدس کے موقع پر پہلی نظم ۱۹۲۶ء میں کہی۔ اور اس کے بعد آج کہ ۱۹۶۹ء ہے۔ برابر عرس شریف پر حاضر ہو رہا ہوں۔ اور ہر دفعہ ایک نظم

جو محض تصوف شیخ اکبر سرکار میراں محی الدین سے لکھی جاتی ہے۔ برابر حاضر کرتا ہوں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء تک پورے بیس سال بٹالہ شریف حاضر ہوتا رہا ہوں۔ اور تقسیم ہند و پاک کے بعد تین سال تک سیالکوٹ میں حضرت اعلیٰ کا قیام رہا۔ تو وہاں جاتا رہا۔ اور اب تقریباً بیس سال سے لاہور فاضلیہ کالونی میں یہ عرس مقدس بڑے اہتمام سے ہوتا ہے۔ اور غوثیہ دربار کا یہ ادنیٰ کتا برابر اس مقدس تقریب میں ایک نظم لکھتا ہے۔ انشاء اللہ کتاب کے کسی حصے میں ان نظموں کے چند نمونے پیش کرونگا۔

میرا تازہ کلام

شاعری کو حقیقت اور انسانیت کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ شاعر کے سامنے کوئی خاص شاعر نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کے سامنے الوہیت کے اسرار ہونے چاہیئے جن سے انسانی ہستی مرکب ہے۔ جن کا حصول انسانی زندگی کا شرف وکمال ہے۔ شاعر کے سامنے کلام شعراء کی بجائے صحیفۂ فطرت ہونا چاہیئے۔

حسن زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس کا مشاہدہ آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔ جس کے باعث قلب میں گوناگوں آرزوئیں اور اُمنگیں پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کی محرک ہیں۔ انہیں آرزؤں اور اُمنگوں کا دوسرا نام عشق ومحبت ہے۔ فطرت ان حقائق کو نورانی الفاظ میں بیان کرتی ہے لیکن شاعر کے سوا کوئی نہیں۔ جو اس کی زبان سے آشنا ہو۔ اس لیے قدرت نے شاعر کو بھیجا ہے۔ تاکہ اس بستی کے رہنے والوں پر ان حقائق کو آشکار کرے۔ شاعر حُسنِ کائنات کو بے حجاب دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ ظاہری پردوں سے گذر کر اشیاء کی حقیقت تک اُتر آتی ہے۔ اسے ہر ذرہ میں آفتاب دکھائی دیتا ہے۔ ہر شے میں شانِ جمالی کے کرشموں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ستاروں کا جگمگانا چاند کا نور برسانا۔ کہکشاں کی ندی کا آسمان پر بہنا۔ قوس وقزح کی رنگینیاں۔ سبزے کی شادابی۔ پھولوں کی رعنائی۔ موجودات کے ہزاروں ایسے خوشنما منظر۔ اُس کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ جن کا عکس اس کے آئینۂ احساسات میں اُتر کر نقش ہو جاتا ہے۔ شاعر مشاہدات اور محسوسات سے لیکر عالمِ وجد وکیف تک کے ہر ہر ارتعاش اور سکون سے کبھی عالمِ ہوش اور کبھی عالمِ بے خودی میں متاثر ہوتا ہے۔ آخر یہی نقوش موسیقی بن کر اس کے نغموں سے بہہ نکلتے ہیں۔ تاثراتِ وجد وحال بن کر اس کے لبوں پر رقص کرتے ہیں۔ اسی کا نام شعر ہے۔ گویا شعر نغمۂ حسن وجمال ہے۔ اور اس عالمِ وجد وکیف کے مربوط خیالات کا نام شاعری ہے۔ انسانیت کے اسی وجدانِ قلبی اور میلانِ ذہنی

کے چند تاثر ان رباعیات کے اجزائے عناصر ہیں۔

شعر کیا ہیں کچھ حسین جلوے ہیں شرمائے ہوئے
چند نغمے دل سے لب تک ٹوٹ کر آئے ہوئے

فیضانِ جمال کے چند مربوط پرتو ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ابر یہ بارشں یہ تلاطم ساقی
رم جھم یہ چھما چھم یہ ترنم ساقی
یہ عشق و جوانی کی ہوائیں توبہ
ہاں ساز اٹھا اور بڑھا خم ساقی

ان الفاظ میں قدرتی ترنم۔ کیف اور رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الفاظ کے ذریعے بوندیوں کے بجتے ہوئے ساز کی صوتی ترجمانی مقصود ہے۔ جیسے کوئی فنکار بربط پر انگلیاں رکھے۔ چوتھے مصرعہ تک پہنچکر شاعر خود بھی اس نغمے کی رو میں بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

برسات کی مست مست راتیں توبہ
توبہ یہ صنم پرست راتیں توبہ
مے بن کے برس رہا ہے بادل ساقی
ساون کی قدح بدست راتیں توبہ
توبہ یہ گھٹاؤں کی سیاہی توبہ
توبہ یہ فضا لامتناہی توبہ
وہ جام بکف زلف بدوش آئے ہیں
توبہ سے میں باز آیا الٰہی توبہ

ہے جام بکف ماہِ تمام اے ساقی
ایسے میں پلا دے کوئی جام اے ساقی
مے اب بھی ہے زاہد کی نگاہوں میں حرام
پیتا ہوں میں لے کر ترا نام اے ساقی

حُسنِ تخلیق ہو رہا ہے۔ اور شاعر اس کی تصویر کھینچتا ہے۔

فطرت کا حصل ہے کرامت شباب کی
رنگینیاں شفق کی ہیں بوندیں شراب کی
گویا کہ جاگ اٹھی ہے دامانِ شرق سے
انگڑائی لے کے پہلی کرن آفتاب کی

طلسم شب ٹوٹ چکا ہے۔ شفق کے لال لال ڈورے شراب برسا رہے ہیں۔ خوابستان مشرق سے عروسِ آفتاب کرنوں کی انگڑائیوں کے ہجوم میں بیدار ہوتا ہے۔ شاعر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

ے فطرت کا ماحصل ہے کرامت شباب کی۔

مصوری اور خمریات کی رنگین آویزش ملاحظہ ہو۔

ہے بال کشا میکدۂ زار وق گھٹا — لو برق تڑپ اٹھی وہ بادل برسا
وہ جھوم کے مستانہ گھٹائیں آئیں — جیسے کوئی رند آتا ہو گرتا پڑتا

برق کی چشمک زنی کے بعد بادل کا برسنا کتنا نیچرل ہے۔ مستئ ہوا کو رندِ لغزیدہ قدم سے تشبیہ دینا ضیاؔ، آرٹ ہے۔

میرے شعرستان کی اصلی بہار دیکھنی ہو تو خمریات دیکھئے۔ رباعی کی خوبصورت اور مشکل ترین صنف جو مجھے عجمی شعرا سے ورثہ میں ملی ہے۔ صرف اس لیے اختیار کی گئی کہ اس میں ایک قدرتی ترنم ہے۔ رودکی نے اسے موسیقی کی جان سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ صناعی اور آرٹ کے بے بدل نمونے آپ کو رباعی میں مل سکتے ہیں۔ انسانی دل کی ازلی تشنگی جب میری رگِ جاں میں پھڑکتی ہے۔ میں کائنات کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ زندگی کو نئے رنگ میں ڈوبا ہوا پاتا ہوں۔ نو بہ نو جلوؤں سے حیات کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ طوفانِ ادب کی اس برہم انگڑائی کا نتیجہ ہمیشہ ایک خوبصورت رباعی ہوتی ہے۔ اس وقت میری کائنات کی ہر شے وارفتگی کیف و نظارہ سے معمور ہوتی ہے۔ ایران اور سبزوار کی خاک مینو سواد سے نسبی اور نسلی رابطے نے میری خاکسترِ حیات میں ہوئے رکنا آباد و گل گشتِ مصلےٰ کی آرزو کو ابھی تک زندہ و پائندہ رکھا ہے۔ فارسی کی گود میں پلی ہوئی شاعری۔ تصوف کی دو آتشہ شراب سے سرشار معنویت میرے میلان ذہنی کو گدگداتی ہے۔ میری روحیت جو نگاہِ مے فروشان سرمدی سے بیدار ہے۔ ہر آن ایسے عالمِ کیف کی متمنی ہے۔ جو کبھی تو مستی اور ہوشیاری کے درمیان کی حالت ہو۔ اور کبھی حریفان را نہ سر ماند نہ دستار۔ ضروری نہیں کہ یہ کیف آور شے شراب یا نظارہ جام و مینا ہو۔ اس کی محرک اکثر تو نگاہِ مرشدِ میخانہ ہوتی ہے۔ اور کبھی ہر شے میں ایک نشہ جھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر دل مسرتِ سماوی سے آشنا ہو۔ جو حاصلِ شاعری ہے تو دل بن پئے مست رہ سکتا ہے۔

سے نہ پیئے اور جھومتا جائے ۔ یہی بے بادہ و جام مستی و سرخوشی، شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔

یہ جنبشِ دل مستیٔ الہام نہ ہو — یا میکدۂ غیب کا اک جام نہ ہو
ایک لرزشِ آواز میری روح میں ہے — شاید یہ ترے وصل کا پیغام نہ ہو

اے دل تجھے آئینۂ اسرار کریں — اے جاں طرب آ تجھے بیدار کریں
ان آنکھوں سے پھر آنکھیں لڑائیں جا کر — یہ جام تہی ہیں انہیں سرشار کریں

جب یہ آنکھوں کے جام سرشار ہو جاتے ہیں۔ دل اور دماغ غرقِ شراب ہو جاتا ہے۔ روح وجد میں آتی ہے۔ اس استغراق میں ذاتِ حقیقی کا سودا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی خراباتی رند پارسا بن جاتا ہے۔ عبادات ظاہری کے رسوم قیود اٹھ جاتے ہیں۔ ایک ہی حقیقت برافگندہ نقاب نظر آتی ہے۔ ہر شے قبلہ بلکہ قبلہ نما معلوم ہوتی ہے۔

ساقی کو ہے سجدہ کبھی ساغر کو سلام — رندوں کی نماز میں نہ قعود اور نہ قیام
میخانہ کی چوکھٹ پہ نمازِ مستی — حق حق میں صراحی ہے، تو ہو ہو میں ہے جام

ہر سُو ہے جمالِ دوست مینا نہ سہی — ہر گام میں لغزش تو ہے پینا نہ سہی
کوثر کی جھلکتی ہوئی موجوں کی قسم — میخانہ ہر اک سانس ہے مینا نہ سہی

ہے صبح برافگندہ نقاب اے ساقی — ہے وقت کہ ہوں غرقِ شراب اے ساقی
آ مثلِ سحر روح کو بیدار کریں — ہے قصۂ گیتی ہمہ خواب اے ساقی

ہر لمحہ نیا جام طرب بھرتا ہوں — ہر گام پہ ہوش سے گذرتا ہوں
جب پہلی کرن آتی ہے میخانے کو — ساقی پہ صراحی پہ نظر کرتا ہوں

جوانی جب اپنے جوبن پر ہوتی ہے۔ تو ہر اثر سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جب سوچے گی۔ جوانی ہی کی باتیں سوچے گی۔ ذیل کی رباعیات اسی شبابی مدوجزر کی پیداوار ہیں۔ ہر مصرعہ میں آپ کو جوانی ناچتی گاتی اور گنگناتی ہوئی دکھائی دے گی۔ ہر رباعی میں ایک جواں دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوگا۔ ان گھنگھور گھٹاؤں۔ بدمست ہواؤں، گلپوش فضاؤں میں ایک ہی جذبہ یعنی شباب برافگندہ نقاب کارفرما ہے۔ جس کے بنیادی اجزاء وعناصر۔ جوانی۔ رقص۔ موسیقی اور بہار ہیں۔

رستا ہوا حوروں کا ترنم ہے جوانی
معصوم فرشتوں کا تبسم ہے جوانی
اک موج ہے چھلکی ہوئی مینائے ازل سے
دریائے محبت کا تلاطم ہے جوانی

میخانہ کے دامن میں وہ پلتی ہوئی راتیں
شیشے میں صراحی میں ڈھلتی ہوئی راتیں
ہیں یاد ابھی خواب فراموش کی صورت
فردوس جوانی کی مچلتی ہوئی راتیں

راتیں بھی جواں چاند کا ساغر بھی جواں ہے
شاعر بھی جواں وہ بت کافر بھی جواں ہے
ساغر سے ارادوں کے چھلکتی ہے جوانی
موسم بھی جواں بادۂ احمر بھی جواں ہے

اے جانِ طرب عارضِ سلمائے حیات
سیمائے جوانی کے درخشاں آیات
اے عالمِ رقص و کیف اے جانِ سرور
اے خالقِ بتخانۂ شعر و نغمات

وہ مست نگاہیں تیری خواب آلودہ
جیسے کوئی ساغر ہو شراب آلودہ
آنکھوں میں ہے نقشہ تیری انگڑائی کا
اللہ رے اے حسن شباب آلودہ

ایک قطعہ سنیئے۔

حواس میں ہے مرے انقلاب اے ساقی
پلائے جا مجھے رنگیں شراب اے ساقی
کہ ہے جواں میری خاکسترِ حیات ہنوز
نگاہ میں ہے کسی کا شباب اے ساقی

اس سلسلے میں کیف و جوانی سے لبریز ایک بہار آلود غزل کے چند شعر سنیئے۔

غزل

جام ایسا شراب ایسی حسن ایسا شباب ایسا — ہم نے تو نہ دیکھا تھا ساقی کبھی خواب ایسا
بینا میں ہو مے جیسے اور مے میں ہو بیہوشی — آغوشِ تخیل میں پلتا ہے شباب ایسا
لی موج نے انگڑائی ذرے بھی تڑپ اٹھے — کس مہر شمائل نے اُلٹا ہے نقاب ایسا
یہ کھول دئے کس نے پھر تا بہ کمر گیسو — میخانہ پہ آیا ہے گھر گھر کے سحاب ایسا
وہ حسن کہ قرباں ہوں رنگینیاں فطرت کی — اور لوٹ ہوں میخانے مستانہ شباب ایسا
یہ بھیس میں کرنوں کے گلزار میں کون آیا — کلیوں نے سحر ہوتے چھیڑا ہے رباب ایسا

دن آئے ہیں پینے کے دن آئے ہیں جینے کے
آئی ہے بہار ایسی اٹھا ہے سحاب ایسا

قلب کے سوتوں سے جذبات کے چشموں کا پھوٹنا اصل شاعری ہے۔ میری شاعری میں آپ قنوطیت آخری حد تک نہیں پائیں گے۔ ایک صوفی کا دل صداقتِ حسن سے لبریز ہے۔ اس کا جمالیاتی نظریہ حسنِ لازوال کی آغوش میں پلتا ہے۔ وہ ہر حال میں حق و صداقت کا سہارا لیتا ہے۔ اس کی روح میں ارمانِ بہشت آفرینی کے جذبات مچلتے رہتے ہیں جن میں ماضی و حال کی اندوہگین تصویریں بھی غرقِ مسرت نظر آتی ہیں۔ غزل پر ایک اعتراض عرصے سے وارد ہوتا ہے۔ کہ اس میں مسلسل خیالات ادا نہیں ہوتے۔ وارداتِ قلبی میں ہم آہنگی اور ربط نہیں ہوتا لیکن آج اردو غزل میں روز افزوں مسلسل خیالات کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ جگر اور جوش اس کے علمبردار ہیں۔ ذیل کی غزل میں آپ میرے تصورِ حسن کو ہر قدم پر ایک تازگی اور شگفتگی سے ہم کنار پائیں گے۔

سایۂ گل سے پھر اُٹھا ہے کوئی دست بجام — چونک اے ولولہ جاگ اے ہوسِ مستِ خرام
نیند سے جاگی ہوئی صبحِ چمن مست نظر — چونکے چونکے سے غزالانِ ختن محوِ خرام
موجِ کوثر میں سموئے ہے بدن کا عالم — چاندنی رات کے سائے میں چھلکتا ہوا جام

لہلہاتے ہوئے عارض پہ کنول کا دھوکا — گنگناتی ہوئی سانسوں میں بہاراں کا خرام
زلفِ شبرنگ کا سایہ ہے کہ دیوانے کا خواب — ایک چھایا ہوا گھن اور الجھتا ہوا دام
زندگی جس میں غزل خواں وہ گھنیری پلکیں — مدھ بھری آنکھوں میں شاداب گناہوں کا پیام
وہ جوانی کہ صراحی بکف و جام بدست — جیسے ساغر میں ڈھلے چھلکے پھر ماہِ تمام
شبنمی جسم سے چھنتی ہوئی تاروں کی کرن — احمریں ہونٹوں سے رستا ہوا گیتوں کا پیام
بربطِ حافظِ شیراز سے پھوٹا ہوا راگ — مستئ شعرِ ضیا، آئینۂ روحِ خیام

گفتنی

شاعری حقیقت اور انسانیت کی ترجمان ہے۔ کسی شاعر کو سمجھنے کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اُس کی شاعری کو اس نظریہ کی روشنی میں دیکھیں جو خود شاعر کا ذاتی نظریہ ہے تنقید سے پہلے ہمیں شاعر کی روح میں اُترنا چاہیئے۔ اور یوں اس کے کارنامے میں گم ہو کر اُس کا ادراک کرنا لازمی ہے۔ اگر ہم کسی صناع کے دل میں اُنس و محبت سے سماکر اس کی روح کو بے نقاب کریں۔ تو اس کے تخلیقی کارناموں کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ لیکن اگر ہم اس کا پوسٹ مارٹم بعض ناقدین کے چند وضع کئے ہوئے اصولوں پر کریں گے۔ تو اس اصول پرستی کی وجہ سے ہم اُن تنوعات سے محروم رہیں گے۔ جو شاعر اپنی دل کی گہرائیوں میں لیے ہوئے ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ فلسفہ کا سرچشمہ دماغ ہے۔ لیکن شاعری ہمارے دل کی پیداوار ہے۔ اس کے سوتے ہمارے دل سے راہ پاتے ہیں۔ اور پھر تمام عالم میں پھیلتے ہیں۔ میرے نزدیک علمی۔ ادبی اور روایاتی پس منظر کے علاوہ آرٹ کا ایک بڑا عنصر الہام و القا ہے۔ مشاہدات اور واردات کو تمثیلوں، تلمیحوں اور استعاروں کی مدد سے سمجھنا آسان نہیں۔ اسی ضرورت کے لیے اشاریت اور رمزیت، سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں شاعری میں قلبی واردات اور نفسی کیفیات کے علاوہ کسی خارجی تجربے کا قائل نہیں۔ انہیں کیفیاتِ نفس کو رمز و کنایہ کی زبان سے ادا کرنا میرے مدرسۂ فکر کا اہم جزو ہے۔ اب رہا رمز و کنایہ کا اچھوتا پن اور ان کا

اور ان کا جاندار ہونا یہیں سے شاعر کا امتیازی درجہ شروع ہوتا ہے۔ میرے ہاں رمزیت مغربی رمزیت کی طرح قدیم روایات کا یک قلم ترک کرنا نہیں۔ فارسی شعراء سے زیادہ میرے خیال میں اب تک کسی شاعری میں رمز و کنایہ کی مثالیں نہیں ملتیں۔ میں قدیم اور جدید کی آمیزش سے ایک ایسا بادہ سرجوش بنانے کا قائل ہوں۔ جو فن (ٹکنیک) کے قیود میں وزن۔ ردیف اور قافیے کے پیمانوں سے چھلکایا جاسکے لیکن با ایں ہمہ میں نے جوشش و مستی کے اظہار کے لئے قافیہ بندی تقلید پرستی اور لفظی تراش خراش کو مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ میں فرانسیسی شاعر بودلیر کی طرح حقیقی شاعر کے لیے جذب و مستی کو لوازمات شاعری سمجھتا ہوں۔ چاہے وہ شراب کی مستی ہو۔ یا شعر و شباب کی یا نیک کرداری کی۔ کیونکہ شاعری درحقیقت جذب و تحیر کی ترجمانی ہے۔

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را   نزاکتہا است در آغوشِ مینا خانۂ حیرت

اس کو یوں سمجھیے۔

حسن کے مشاہدات نے دل میں نور اور آنکھوں میں سرور بخشا۔ قلب میں گوناگوں امنگیں اور آرزوئیں پیدا ہوئیں۔ یہی زندگی کی محرک تھیں۔ انہیں کا دوسرا نام عشق و محبت تھا۔ فطرت نے ان حقائق کو نورانی الفاظ میں بیان کیا۔ لیکن شاعر کے سوا کسی نے نہیں سُنا۔ شاعر نے رومانیت اور رمزیت کے عناصر سے کام لے کر اپنے اندرونی جذبات اور تاثرات کو عالمِ خارجی پر طاری کر دیا۔ حقائق کائنات کی تفسیر اس قدر مشکل تھی کہ رمز و کنایہ سے ہی اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔ شاعر محسوسات و مشاہدات کی دنیا سے بیک جنبش دل عالم وجد و کیف تک پہنچا۔ یہاں کے ہر ارتعاش و سکون سے کبھی عالمِ ہوش اور کبھی عالمِ بیخودی میں متأثر ہوا۔ آخر یہی نقوش موسیقی بن کر اس کے نغموں سے بہہ نکلے۔ تاثرات وجد و حال بن کر اس کے لبوں پر رقص کرنے لگے۔ اسی کا نام شعر تھا۔

یہ جنبشِ دل مستیٔ الہام نہ ہو   یا میکدۂ غیب کا ایک جام نہ ہو
اک لرزش آواز میری روح میں ہے   شاید یہ تیرے وصل کا پیغام نہ ہو۔

رباعی

رباعی کی خوبصورت اور مشکل ترین صنف جو مجھے عجمی شعراء سے ورثے میں ملی ہے۔ صرف اس لیے اختیار کی گئی ہے۔ کہ اس میں ایک قدرتی ترنم ہے۔ جمہور کی رائے میں رباعی کا موجد ابوالحسن رودکی ہے۔ محمد بن عیش خوارزمی لکھتا ہے۔ ایک مرتبہ عید کے دن رودکی چلا جارہا تھا۔ راستہ میں دیکھا۔ کہ چند لڑکے جوز بازی کر رہے ہیں۔ اور بہت لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ گیارہ سال کے ایک حسین لڑکے نے چند جوز گچی میں ڈالے۔ سب جوز گچی میں جا پڑے۔ صرف ایک رہ گیا۔ اور وہ بھی گچی کی طرف لڑھک رہا تھا۔ جس کو دیکھکر لڑکا بیساختہ بولا ؎ غلطاں غلطاں ہمی رود تا سر گو۔

رودکی نے جب اس جملے کی طرف غور کیا۔ تو اس کو عروض کے مطابق پایا۔ اور چوبیس وزن بحر ہزج سے اس کے لیے نکالے۔ اور دوبیتی کہہ کر اس کا نام ترانہ رکھا۔ ؎ غلطاں غلطاں ہمی رود تا سر گو۔ چونکہ یہ مصرع رباعی کی بنا ہے۔ لہٰذا اکثر شعراء نے اس وزن پر رباعیات لکھی ہیں۔ اس لیے یہ وزن رباعی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ صاحب سروری اور شرح نصاب کا قول ہے۔ کہ رباعی بحرِ ہزج اخرم اور اخرب میں آئی ہے۔ جو رباعی اس وزن پر نہ ہو۔ وہ رباعی نہیں قطعہ ہے۔ دونوں کا ایک ایک وزن بطورِ مثال ملاحظہ فرمائیں۔

ہزج اخرم :۔ مفعولن۔ مفعول۔ مفاعیل۔ فعول۔

ہزج اخرب :۔ مفعول۔ مفاعیل۔ مفاعیل۔ فعول۔

شجرہ اخرب کے اوزان شجرۂ اخرم کے اوزان سے سبک تر اور مطبوع تر ہیں۔ میں نے بھی بیشتر رباعیات شجرۂ اخرب کے اوزان میں کہی ہیں۔ فارسی کی بعض دوبیتیاں بحرِ ہزج مسدس محذوف میں ہیں۔ جس کے ارکان ہیں۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ فعولن۔ حالانکہ یہ رباعی کا بحر نہیں لیکن اہل ایران میں باباطاہر عریانؒ اور ہندوستان میں شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ نے لالۂ طور وغیرہ میں اسی بحر میں رباعیات کہی ہیں۔ چنانچہ اس مجموعے میں مسائل الست

کے عنوان کے تحت جو رباعیات آئی ہیں۔ وہ اسی بحر میں ہیں۔ اگر اہلِ فن اُسے رباعی نہ کہیں تو قطعہ کہہ دیجئے۔ لیکن اکثر اہلِ ایران نے اسے رباعی کہا ہے۔ رودکی ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک بڑے موسیقار تھے۔ انہوں نے رباعی کو جانِ نغمہ اور روحِ ترنم سمجھ کر اختیار کیا۔ ان کے بعد فارسی میں مستقل رباعی گو شعراء پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تمام عمر رباعی کے سوا کچھ نہیں کہا۔ جن کی شہرت اور بقائے دوام کا باعث صرف رباعی ہے۔ جن میں خیام اور حضرت ابوسعید ابوالخیر رح کے اسمائے گرامی سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔

"کچھ اپنے متعلق"

ایران اور سبزہ وار کی خاک مینوسوار سے نسلی اور نسبی رابطے نے میری خاکستر میں ہوائے رکناباد و گلگشت مصلیٰ کی آرزو کو ابھی تک زندہ رکھا ہے۔ میری مادری زبان فارسی ہے۔ جو اپنی چند در چند خصوصیات کے باعث ابھی تک خاندان میں باقی ہے۔ ہمارے کنبے میں ایرانی کلچر کی جھلکیاں آج بھی نظر آتی ہیں۔ ہمارے تمدن اور معاشرت میں آپ کو بہت سی ایرانی خصوصیات ملیں گی۔ جسے میرے ہندوستانی دوست بہت پسند فرماتے ہیں۔

رباعی کے متعلق لکھتے وقت مولوی وجاہت حسین صاحب عندلیب شادانی کی کتاب ترجمہ و شرح رباعیات باباطاہر سے بعض عبارتیں لی گئیں ہیں۔ خاص طور پر جناب حفیظ جالندھری تو اس تہذیب پر لوٹ ہیں۔ میرا آغاز سخن بھی فارسی زبان سے ہوا۔ لیکن زمانے کا ساتھ دینے کے لیے ابتداء میں جبراً اردو کی طرف آنا پڑا۔ سوچا کہ برِ صغیر میں مرنا جینا ہے۔ اس خاک سے اٹھا ہوں۔ اور اسی میں فنا ہونا ہے۔ سوا اس کے چارہ نہیں کہ اردو ہی کو اظہارِ خیال کے لیے اختیار کروں۔ اردو فارسی کی گود میں پلی تھی۔ اپنی قدرتی صلاحیت اور لوچ کے باعث برابر طبیعت پر چھاتی رہی۔ اور اس طرح ساتھ ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتا رہا۔ حافظ۔ خیام اور نظیری سے دلبستگی کے باعث کلام پر ان کا اثر غالب رہا۔ خاص طور پر رباعی لکھتے وقت خیام اور حافظ کے گہرے اثرات سے دامن چھوڑانا مشکل ہو گیا۔ ابھی بیس برس کی عمر تھی۔ جوانی پورے جوش پر تھی کہ ایک مجذوب کی نگاہ نے کائنات

بدل دی۔ طبیعت کا رجحان تصوف کی جانب اس قدر بڑھ گیا۔ کہ بڑھتے بڑھتے خود فراموشی اور خود رفتگی کی حد تک پہنچا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک نیم مجذوب کی سی حالت رہی۔ جو بعد میں ایک سالکِ راہِ خدا کی بیعت اور صحبت سے اعتدال پر آگئی۔ اس دور کے کلام میں عجیب کیفیت ہے۔ میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ان دنوں بزمِ سخن پورے عروج پر تھی۔ اس کے مشاعروں میں شرکت کرتا رہا۔ اگرچہ شعر کہنے کی صلاحیت نہ تھی۔ لیکن شعر کا اثر میرے قلب پر عجیب طرح پر ہوتا تھا۔ اور اس طرح بزمِ سخن ہی میں میرا شاعرانہ شعور بیدار ہوا۔ اس وقت بزمِ سخن ایک باوقار جماعت تھی۔ جس میں فارسی اور اردو کہنے والے شاعر موجود تھے لکھنؤ اور دہلی کی کلاسیت کا اثر ان لوگوں پر چھایا ہوا تھا۔ کلاسیت کی قید و بند سے نکلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس عرصے میں میری طبیعت کو ہمیشہ ایک نئے افق، ایک نئے میدان اور ایک نئی جولانگاہ کی تلاش رہی۔ میری شہرت کا آغاز بھی اسی وقت سے شروع ہوا۔ جب میں نے کلاسیت کے قید و بند کو توڑا۔ ان دنوں حفیظ جالندھری صاحب مخزن نکالتے تھے۔ برادرم عبدالودود خان قمر جسے آپ میرا جنم ساتھی سمجھیں، میڈیکل کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ان کے ذریعے حفیظ صاحب سے غائبانہ تعارف ہوا۔ مخزن میں میرا کلام چھپتا رہا۔ جسے اہلِ پنجاب نے بہت پسند کیا۔ یہی تعارف جناب حفیظ صاحب کے ساتھ ایک گہری اور دائمی دوستی میں تبدیل ہوا۔ چنانچہ صبوحی کو آج برِ صغیر کے اس بڑے شاعر کے نام سے معنون کیا ہے۔

رباعی کا موضوع

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی۔ ہر صورت میں ادب زندگی سے متعلق ہے۔ زندگی کی طرح ادب بھی جاندار اور ارتقا پذیر ہے۔ اس لیے انفرادی اور اجتماعی زندگی سے اس کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں زندگی ہمیشہ زندگی رہتی ہے صرف اس کی قدریں بدلتی ہیں۔ عشق ہمیشہ عشق ہے۔ صرف اس کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے
چندیں سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میری شاعری داخلی شاعری ہے۔ قلبی کیفیات اور دلی جذبات کی لفظوں میں مصوری ہے۔ فارسی کی گود میں پلی ہوئی شاعری اور تصوف کی دو آتشہ شراب سے سرشار معنویت ہے۔ میری روحیت نگاہِ مے فروشان سرمدی سے بیدار ہے۔ وہ ہر آن ایک ایسے عالمِ کیف کی متمنی ہے۔ جو کبھی تو خیام کی طرح عالمِ مستی اور عالمِ ہوش کی درمیانی حالت ہو۔ اور کبھی حافظ کی طرح ؎ حریفاں را نہ سرماند نہ دستار۔ یہ کیف آور شے شراب اور نظارۂ جام و سبو ہرگز نہیں بلکہ اس کی محرک نگاہ مرشد میخانہ ہے۔ دل میں ایک مسرت کا طوفان ہے۔ یہ جوشِ انبساط جب میرے میلانِ ذہنی کو گدگداتا ہے تو ہر شے میں ایک نشہ جھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بقول ایک محقق کے اگر دل مسرتِ سماوی سے آشنا ہو تو دل بن پیئے بھی مست رہ سکتا ہے۔

؎ نہ پیئے اور جھومتا جائے۔

صداقت حسن میرا ایمان ہو چکا ہے۔ مایوسی اور نا اُمیدی کو میری کائنات میں دخل نہیں۔ عشق نفس گرم ہے خلش آرزو ہے۔ وہ زندگی کے روحانی اور وجدانی عنصر کو مادی اور حیوانی عنصر پر غالب کر دیتی ہے۔ دل جذب و تاثیر کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ میں جن کیفیات کا حامل ہوں۔ وہی کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ اور وہی اوروں کو دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس مادی ماحول میں رہ کر آپ کیسے باور کریں گے۔ کہ میرے دل کی دنیا اور اس کی ہر شے کیف و نظارہ سے معمور ہے۔ اپنے نفس گرم سے ماحول کو جاندار بنانے کی خاطر دل کے نغمے الاپتا ہوں۔ انسانی دل کی ازلی تشنگی جب میری رگِ جان میں پھڑکتی ہے۔ تو میں کائنات کو مسرت میں ڈوبا ہوا پاتا ہوں۔ طوفانِ ادب کی اس برہم انگڑائی کا نتیجہ ہمیشہ ایک دلکش رباعی ہوا کرتی ہے۔

ہر لمحہ نیا جام طرب بھرتا ہوں
ہر گام پہ ہوش سے گزرتا ہوں
جب پہلی کرن آتی ہے میخانے میں
ساقی پہ صراحی پہ نظر کرتا ہوں

اس کے معنی یہ نہیں کہ میں غم و آلام سے یکسر مبرا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس غم و اندوہ میں نزار نالی اور حرماں نصیبی نہیں۔ نا امیدی اور مایوسی کو میں اپنے پاس

بھٹکنے نہیں دیتا۔ تاہم غم کو انسانی معراج تصور کرتا ہوں۔ غم کی آمیزش ہی نے تو میری حیات میں شیرینی پیدا کی ہے۔ مجھے بنی نوع کی زبوں حالی کا شدید احساس ہے۔ بیشک جس روح میں ارمانِ بہشت آفرینی کے جذبات مچلتے ہوں، اس میں ماضی و حال کی اندوہگین تصویریں بھی غرقِ مسرت نظر آتی ہیں۔ اس کا تصورِ حسن ہر لمحہ ایک نوی اور شگفتگی سے ہمکنار رہتا ہے۔

دل رقص میں ہے جوشِ طرب کیا کہنے　　گویا ہے رواں بادہ بہ لب کیا کہنے
اے مستئ الہام سنبھلنے دے مجھے　　یہ نغمۂ دل آخرِ شب کیا کہنے

سرحد جیسے گمنام گوشے میں رہنے کے باعث مجھے کسی ایسے اہلِ فن سے کسبِ کمال کا موقع نہیں ملا جس کی بنا پر میں کہہ سکوں۔ کہ میرا کلام فنی غلطیوں سے مبرا ہے۔ نہ دعوئ فن، نہ دعوئ زبان دانی۔ میں تو تمام عمر دیہاتی ماحول میں پشتو اور گھر میں فارسی بولتا رہا۔ کسی قدر پڑھی ہوئی اردو سے کوئی اہل زبان کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ اردو کی عالمگیری ہے۔ کہ آج اس کا علم خیبر سے راس کماری تک لہرا رہا ہے۔ آج ہمارا صوبہ بھی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ کہ ہم اردو کے خادم ہیں۔ صوبے میں اردو کے متعدد ادارے ہیں۔ دائرہ ادبیہ پشاور کے علاوہ تقریبًا ایک زمانے سے پشاور میں "انجمن ترقی اردو" کی بنیاد بھی رکھی جا چکی ہے۔ میں آخر میں جناب نذیر مرزا برلاس، جناب سید فارغ بخاری، جناب خاطر غزنوی اور باقی اراکین انجمن ترقی اردو کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے مقدمہ۔ تعارف تدوین اور مسودات کی ترتیب میں میرا ہاتھ بٹایا۔ یہ خدائے تعالیٰ کی مدد اور احباب کی کاوشوں اور مفید مشورں کا نتیجہ ہے۔ کہ صبوحی آج انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام چھپ رہی ہے۔ ورنہ میرا فطری تساہل ہی اگر کارفرما ہوتا۔ تو خدا جانے یہ کب زیور طبع سے مزین ہو سکتا۔

اقبال کا تصورِ حیات و موت

زندگی کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ اس کا مآل کیا ہے؟ اس طرح کے سوالات ہمیشہ سے لوگوں کو الجھاتے رہے ہیں۔ فلسفی، مفکر، دانشمند، صوفی، شاعر سبھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوششوں میں لگے رہے ہیں۔

کسی نے کہا زندگی چند روزہ ہے، جو تمہارے سامنے ہے۔ یہی سب کچھ ہے، اسی کو ہنس بول کر گزار لو۔ تو اچھا ہے۔ کسی نے سوچا۔ زندگی بے اعتبار اور ناپائدار ہے۔ اس سے دل لگانے میں کوئی فائدہ نہیں، زندگی ہی میں زندگی سے کنارہ کشی کر لو تو بہتر ہے۔

غرض کوئی موت سے ڈرا اور کوئی زندگی سے اُلجھا۔ مگر حقیقت اور اصلیت کو کوئی نہ پا سکا۔ آخر اکتا کے اور گھبرا کے اکثر تو یوں چلّا اٹھے کہ:

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا (فانی)

اقبال مشرقی اور مغربی علوم کے ماہر تھے۔ وہ مفکر بھی تھے۔ اور شاعر و فلسفی بھی۔ انہوں نے فلسفۂ زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ اور اس کی حقیقت کو جاننے کے بعد سمجھا کہ اصلیت وہ ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔

اسلام نے بتایا ہے۔ کہ "جو خدا کی راہ میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، اور اپنی اِس ظاہری زندگی کو اسی کی راہ میں ختم کر دیتے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں مرتے۔ بلکہ انہیں تو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ انعام خداوندی سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔" اقبال نے سوچا تو عقل اور فلسفہ کی رو سے بھی یہی راستہ انہیں صحیح اور سچا نظر آیا۔

بات دراصل یہ ہے۔ کہ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن اپنے ماحول سے وابستگی، اور کارہائے دنیا پر شیفتگی انسان کے دل میں زندگی کی محبت سے زیادہ موت کا ڈر بٹھا دیتی ہے۔ اور وہ چاہنے لگتا ہے کہ کاش موت اسے نہ چھوئے، اور اس کی یہی عارضی زندگی مستقل بن جائے۔ لیکن موت

کا یہ خوف صرف اس لیے ہوتا ہے۔ کہ وہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد کچھ نہیں رہتا۔ مگر اسلام نے ہمیں بتایا ہے کہ زندگی جب موت کا روپ دھار لیتی ہے۔ تب بھی باقی رہتی ہے۔ موت زندگی کو ختم نہیں کرتی، بلکہ اس طرح زندگی ایک نئے لباس میں اور نئے چولے میں جلوہ گر ہو جاتی ہے اور بس۔

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز کی ایک ابتداء اور انتہا ہے پھر یہ کہ اگر سعی و کاوش صحیح طور پر کی جائے تو ہر چیز بجائے خرابی کے بہتری کی طرف بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا وقت آتا ہے۔ جب رات کی تاریکیاں ہر چیز کو ڈھک لیتی ہیں لیکن یہ تاریکی دوامی نہیں ہوتی۔ تاریکی کے بعد روشنی، شام کے بعد صبح، اور رات کے بعد دن ضرور نمودار ہوتا ہے۔ تو پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی موت کی گود میں جاکر سوئے۔ تو پھر ہمیشہ اس اندھیارے میں بھٹکتی رہے۔ اس کے بعد بھی ضرور حیات کی روشنی نمودار ہوگی۔

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اسی طرح فرماتے ہیں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اقبال نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زندگی کی تابناک حقیقتوں کو سمجھا اور دیکھا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس بات پر افسوس کیا ہے۔ کہ اسلام کے نام لیوا بھی اسلام کی راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں۔

ترے سینے میں ہے۔ پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

چنانچہ انہوں نے بڑی وضاحت سے یہ راز ہم کو بتایا۔ مگر چونکہ انہوں نے یہ بھید کی باتیں شاعرانہ رمز و ایہام اور استعارہ و کنایہ کے پیرائے میں بیان کی ہیں۔ اس لئے ان پر پوری طرح غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ ان کی گہرائی تک پہنچا جا سکے۔

اقبال اول تو ہمیں یہ سمجھاتے ہیں۔ کہ زندگی اس آگ کے مانند نہیں جو جل بجھ کر ختم ہو جائے اور راکھ بن جائے۔ یا اس موتی کی طرح نہیں جو ٹوٹ پھوٹ کر اور ریزہ ریزہ ہو کے ختم ہو جاتا ہے، بلکہ وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں۔

ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

اور ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ قدرت کی عزیز ترین شے زندگی ہے۔ اس لیے قدرت نے ہر چیز کی فطرت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ اقبال اس کے لیے ایک دلچسپ دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ موت کا عام ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ زندگی جیسی قیمتی چیز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ نیند بھی تو آخر ایک عام شے ہے۔ مگر سو جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے۔ کہ انسان کی زندگی میں اس سے کوئی خلل آ گیا۔

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

پھر کہتے ہیں کہ نقشِ حیات کی یہ ظاہری ناپائداری درحصل کچھ اور معنی رکھتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بالکل سامنے کی چیزوں سے مثالیں دے کر اس مشکل پہیلی کا بوجھ آسان بنا دیا ہے۔ دیکھیے! پانی میں ہوا گھس جاتی ہے۔ تو بلبلا پیدا ہوتا ہے۔ مگر چند لمحوں سے زیادہ برقرار نہیں رہ سکتا، مٹ جاتا ہے لیکن ایک مٹتا ہے تو دوسرا ابھر آتا ہے۔ وہ بھی مٹ جاتا ہے۔ تو ایک اور بلبلا سامنے آ جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہوا ایسے ہزاروں لاکھوں بلبلے بنانے کی قدرت رکھتی ہے۔ اس لیے وہ بنانے بگاڑنے اور پھر بنانے کا یہ سلسلہ جاری رکھتی ہے۔ صرف اس لیے کہ اپنی قوتِ تعمیر سے کام لے کر وہ بہتر سے بہتر مشکل بنانا چاہتی ہے۔

ستاروں کو دیکھیے۔ سارے آسمان پر ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ خدا جانے کتنی مدت سے اسی طرح چلے آ رہے ہیں۔ کبھی نکل آتے ہیں۔ کبھی چھپ جاتے ہیں۔ کبھی روشن ہو جاتے

ہیں، کبھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ انسان صدیوں سے ان کا راز پانے کی کوشش میں ہے۔ مگر اب تک ان سب کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ تو جو انسان ستاروں کے بھید نہ پا سکا وہ حیات جیسی پاکیزہ، نورانی اور مقدس حقیقت کی تہہ تک کیسے پہنچ سکے گا۔ حیات کا بھید ستاروں سے بھی گیا گزرا ہے!!

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟

اس کے بعد وہ زندگی اور موت کی حقیقت سمجھانے کے لیے ایک بڑی خوبصورت مثال پیش کرتے ہیں۔ دیکھیے کسان مٹی کی تہوں کے نیچے دانے کو دفن کر دیتا ہے۔ اس کے ظاہری معنے تو یہ ہوئے کہ وہ دانہ مر گیا، دفن ہو گیا۔ اور مٹ گیا۔ مگر نہیں۔ اس دانے میں خود نمائی کی قوت ہوتی ہے۔ زمین کے اندر دبا ہوتا ہے۔ مگر اس کی قوتِ نمو، اس کا سوز زندگی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ آخر وہ زمین کا سینہ پھاڑ کے باہر نکل آتا ہے۔ گویا موت کی گود میں جا کے زندگی کا ایک نیا چولا بدلتا اور نیا روپ دھارتا ہے۔ بس یہی حال انسان کا ہے۔ کہ موت کے آغوش میں پہنچکر زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ اور بس۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اور ظاہر ہے کہ خواب شیریں کے مزے لینے کے بعد آدمی کی تھکن دور ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے اندر ایک نئی چستی اور توانائی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی بھی موت کی نیند کے بعد زیادہ حسین، زیادہ قوی اور زیادہ تابناک ہو جاتی ہے۔

اصل میں سب خرابی اس بات سے پیدا ہوتی ہے۔ کہ ہم زندگی کو ایک محدود اور مٹ جانے والی چیز سمجھتے رہے ہیں۔ ہم اس بات کو بھی بھول گئے ہیں کہ زندگی موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔ ہم زندگی کو بھی اسی طرح ناپ تول کر دیکھنا سمجھنا چاہتے ہیں۔ جس طرح دنیا کی دوسری تمام چیزوں کو۔

ہم یہ سوچتے ہی نہیں کہ سقراط کی موت اور امام حسینؓ کی شہادت موت نہیں زندگی ہیں۔ ہمارے غلط تصورات کی بنیاد یہ ہوتی ہے۔ کہ ہم ناقص اور غلط پیمانوں سے زندگی کو ناپتے پرکھتے ہیں۔ اگر ہم ذرا سا بھی غور کریں تو بہت سے بھید کھل جائیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے، زندگی

اقبال ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی ایک ایسی قوت ہے۔ جو ہر شکل و صورت میں موجود۔ اور ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ آسمان، سورج، چاند، ستارے سب اسی کے مظاہر ہیں۔ پہاڑ، دریا، باغ، بیابان سب میں یہی جلوہ گر ہے حیوان، انسان، چرند، پرند سب میں اسی کا ظہور ہے۔ اور ان میں سے ہر چیز زندگی کی قوت سے تڑپتی بھڑکتی رہتی ہے۔

ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی — دما دم رواں ہے یمِ زندگی
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دُود — اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود

زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شے کو قوتِ نمو، جوشِ اظہار، شوقِ جستجو اور ذوقِ تسخیر عطا کرتی ہے۔ زندگی کو کہیں ٹھیراؤ اور سکون نہیں ہوتا۔ سکون و ثبات کا رشتہ موت سے ہے۔ نہ کہ زندگی سے، زندگی ایک ایسا قافلہ ہے۔ جو برابر آگے بڑھے جاتا ہے۔ راستے کی مشکلات اور منزلوں کے مصائب اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے اس کے ذوقِ طلب اور شوقِ جستجو کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ کائنات کے ذرے ذرے میں یہی جذبہ اور یہی ولولہ کارفرما ہے۔ اور جہاں یہ بات نہیں وہاں زندگی بھی نہیں، فریبِ نظر ہے۔

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اقبال کہتے ہیں۔ کہ زندگی موت سے بالا و برتر طاقت ہے۔ اس لیے یہ سوچنا کہ زندگی موت سے ڈرے گی۔ اور وحشت کرے گی۔ بے معنے بات ہے۔ یہاں تو اس کے برعکس زندگی موت کے تعاقب اور تلاش میں ہے۔ اور موت ہر قدم پر اس سے شکست کھاتی رہتی ہے۔ زندگی ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے۔ اسے موت کا کیا خطرہ!! موت بچاری کی کیا حیثیت کہ زندگی کا رستہ روک سکے!!

اُتر کر جہانِ مکافات میں　　　　رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج　　　　اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے　　　　اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات　　　　ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

دراصل دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں اسی لیے بھیجا جاتا ہے۔ کہ کھوٹے کھرے اور اچھے بُرے کو پرکھا جائے۔ کھروں اور اچھوں کو موت نہیں آتی۔ جو امتحان میں پورا اُترے۔ وہی کامیابی کا تمغہ پاتا ہے۔ بُرے اور کھوٹے سے کسی کو دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہوتی، وہ مٹتا ہے۔ تو مٹ جائے، اور مرتا ہے تو مر جائے۔ اس کی زندگی بھی بے معنے اور بیکار تھی، اس لیے اس کی موت پر بھی کسی حسرت و افسوس کی ضرورت نہیں۔ باغ سے خار و خس نکال پھینکتے ہیں۔ تو اس سے باغ اُجڑتا نہیں، اور زیادہ نکھر سنور جاتا ہے۔

تجھکو پرکھتا ہے یہ، مجھکو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں، اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

جو چیز زندگی کو دوام بخشتی ہے وہ قوتِ عشق ہے۔ جب زندگی عشق کی پناہ میں آجاتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ جب زندگی کا محرک جذبہ عشق بن جاتا ہے۔ تو پھر موت چھو بھی نہیں سکتی۔ اقبال نے اس بات کو ایک قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے

ہیں کہ ایک روز اتفاقاً عشق کے فرشتے کو راستے میں موت کا فرشتہ مل گیا۔ اس نے پوچھا تو کون ہے۔ موت کے فرشتے نے جواب دیا۔ میں موت ہوں۔ میں زندگی کی چنگاری کو بجھاتا اور جامۂ زندگی کے ٹکڑے اڑاتا ہوں۔ میری آنکھ کا ایک اشارہ فنا کا پیغام ہوتا ہے"

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی — ہنسی اس کے لب پر ہوئی آشکارا
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر — اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ — قضا تھی، شکار قضا ہو گئی وہ

اقبال کی اصطلاح میں عشق ایک ایسے اہم جذبے اور ایسی زبردست طاقت کا نام ہے۔ جو ازلی و ابدی ہے۔ جو نمود، اظہار اور تسخیر پر اُکساتا ہے۔ جس پر کوئی دوسری شے اثر نہیں ڈال سکتی۔ اور ہر چیز جس کی زد میں ہے۔ جس میں ایسی تڑپ، ایسی حرکت اور ایسا اضطراب شامل ہے، جو برابر آگے بڑھتا اور بڑھاتا رہتا ہے۔ جسے نہ کہیں سکون ہے نہ قرار۔ جو راہ و منزل سب سے قطع نظر کر کے برتر سے برتر مدارج اور اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات کی طرف چلتا اور چلاتا رہتا ہے۔ اور آخر صاحبِ عشق کو ابدی و جاودانی حیات بخش دیتا ہے۔ اور پھر خود وہ ہی نہیں، اس کا ہر عمل، اس کا ہر کارنامہ زندگی جاوید پالیتا ہے۔ اسے کوئی طاقت فنا نہیں کر سکتی۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو — عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

زندگی کی ان قوتوں کا عرفان ہر ایک کو نہیں ہوتا، اور نہ ہر شخص یہ احساس رکھتا ہے۔ کہ مدارجِ حیات کو طے کرنے کے لیے جذبہ عشق کی رہنمائی از بس لازم ہے۔ اسی لیے اقبال نے "عرفانِ خودی" کی تبلیغ کی ہے۔ اسی سے انہوں نے اپنے پیام کا آغاز کیا۔ اور اسی کو منتہائے آمال قرار دیا۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود — مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود — کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

زندگی کیا ہے؟ اپنی خودی کا احساس کرنا۔ اپنے ماحول کو جاننا اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنا۔ آخری دونوں باتیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک پہلی نہ مل جائے۔ اس لیے احساسِ نفس (خودی) مقصدِ اول ہے لیکن مشرق و مغرب اس راز سے ناواقف نظر آتے ہیں۔" (سیرتِ اقبال)

خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور

علامہ اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں اپنے نظریہ خودی کی تشریح سمجھائی تھی۔ اس ذیل میں آپ نے فرمایا تھا۔ "حیات کیا ہے؟ حیات ایک انفرادی شے ہے۔ اس کی سب سے اعلیٰ صورت "خودی" ہے۔ جس کے حصول کے بعد فرد ایک مکمل اور قائم بالذات مرکز بن جاتا ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر کہتے ہیں۔ انسان کے اندر حیات کا مرکز خودی یا شخصیت ہے۔ شخصیت کشاکش کی ایک کیفیت ہے اور اس کیفیت کی بقا سے ہی قائم رہتی ہے۔ اگر یہ کیفیتِ کشاکش قائم نہ رہے۔ تو اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے..... خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔ عشق کا لفظ میں نے بہت وسیع معانی میں استعمال کیا ہے جس میں تسخیر کرنے اور جذب کرنے کی آرزو شامل ہے۔ اس کی اعلیٰ صورت اقدار اور مقاصد کی تخلیق اور پھر ان کے حصول کی کوشش ہے۔"

اسی لیے اقبال نے اپنی تصنیفات میں ہر جگہ معرفتِ خودی اور تعمیرِ خودی پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر خودی نہیں تو تمام دنیاوی علوم و فنون بیکار ہیں۔" (سیرتِ اقبال)

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجود

گر ہنر میں نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود

مکتب و مدرسہ جز درسِ نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہد بود

علامہ نے حیات اور خودی کا باہمی علاقہ ان چند شعروں میں بڑی سادہ تمثیل میں

سمجھایا ہے، فرماتے ہیں۔

(زندگی کی تفسیر ہے کہ)

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس　　ازل سے ابد تک رم یک نفس
زمانہ کہ زنجیر ایام ہے　　دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے
یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے　　خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے۔ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے۔ بیداریٔ کائنات

خودی کی یہی قوت ہے۔ جس کی بدولت " عارف خودی کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے، جس کی سرحد موت سے بھی ماوراء ہے۔ اور موت بھی اس کو فنا نہیں کر سکتی۔ (سیرتِ اقبال)

زندگانی ہے صدف۔ قطرۂ نیساں ہے خودی　　وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

حیات و موت کے اس رشتہ کو ایک اور جگہ اس سے زیادہ وثوق سے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے　　اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے۔
مہ و ستارہ مثال شرارہ یک دو نفس　　مے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے۔

غرض حیات جس کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ موت سے کسی حال میں بھی شکست نہیں پا سکتی۔ اس لیے کہ خودی کی قوت اسے ابدی زندگی بخش دیتی ہے۔ اور عشق کی رہنمائی اس کائنات ہی میں نہیں، ماورائے کائنات بھی اسے برابر مقاصد اعلیٰ کی جانب بڑھاتی رہتی ہے۔ چنانچہ اقبال نے اپنے پیام میں اس حقیقت کو بار بار واضح کیا ہے۔ کہ جب مردِ خدا میں خودی کی قوت زندہ اور بیدار ہو جائے۔ اور عشق کا جذبہ اس کا رہبر ہو۔

اسے کوئی رکاوٹ، کوئی دشواری، کوئی سدِ سکندری آگے بڑھنے اور منازل عالیہ تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ ہماری ابتدائی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اور ساری کائنات اس کی شہادت دے رہی ہے لیکن یہی خودی کی قوت اور عشق کا جذبہ اگر مردہ ہو جائے تو انسان خس و خاشاک سے زیادہ حقیر ہو جاتا ہے۔ اور ذرّوں اور تنکوں جیسی معمولی قوتوں کے سامنے بھی پست نظر آنے لگتا ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات ۔۔۔ کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا ۔۔۔ ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات

خودی ہے مردہ تو مانند کاہ پیش نسیم

خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات

بیا تا گل بیفشانیم

سرمد شہید

سرِ غمِ عشق بلہوس را ندہند | سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید تا یار آید بکنار | ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

سرمد عہدِ مغلیہ کی ایک دلچسپ شخصیت تھے۔ سرمد رباعی گو شعراء میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سرمد نے انسان کی زندگی اور اس کے مقدر پر گہری اور پُر تامل نظر ڈالی۔ اور سوچ سمجھ کر جس نتیجے پر پہنچے۔ اُس کی سرحدیں فراریت اور ماورایت سے ملتی جلتی ہیں۔ سرمد انسان کی مجبوریوں اور ناکامیوں کو ایک اٹل اور ناقابل شکست تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک باغیانہ انداز میں اس سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ہم کو بھی ترغیب دیتے ہیں۔ سرمد، خیام کی طرح قضا و قدر کے ساتھ تمسخر تو نہیں کرتے اور نہ حافظ کی طرح شراب و شاہد میں تمام حوادثاتِ زندگی کو بھولنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ حقیقت اور معرفت کے دائرے میں پناہ لیکر ترک و بے نیازی کی تعلیم دیتے ہیں جو افلاطونی فلسفہ اور جوگ تیاگ سے کچھ ہی مختلف ہے لیکن اس فرار کے باوجود جب ان کی حکیمانہ اور کلیمانہ بصیرت خدائے تعالیٰ کو شش جہت سے کائنات پر محیط دیکھتی ہے۔ تو پکار اُٹھتے ہیں — !!

سرمد جمعیت جانش در دستِ کسے ست | نا میست دلے نشانش در دست کسے ست
میخواست کہ مرغے شدہ از دامِ جہد | گاوے شد و ریسمانش در دست کسے ست

اگرچہ سرمد کے کلام میں کوئی خاص عملی پیغام نہیں لیکن اُن کی قنوطیت میں مسئلہ جبر و قدر کا ایک حل ضرور ہے۔ اور وہ حل ہے۔ جان بہ جان آفریں سپردن — !!

سرمد گلہ اختصار می باید کرد | یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید کرد | یا قطع نظر ز یار می باید کرد

مشربِ نیستی اور فنا اس قدر غالب ہے کہ لباس تک کی تن پر گنجائش نہیں۔ ؎

سر برہنہ نیستم دارم کلاہِ چار ترک | ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ ترکِ مولیٰ ترکِ ترک

ترک کا یہ ارفع مقام ایسے ہی شہبازِ وقت کو زیب دیتا ہے۔ جو شہنشاہِ وقت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

آنکس کہ ترا کارِ جہانبانی داد | مارا ہمہ اسبابِ پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کرا عیبے داد | بے عیباں را لباسِ عریانی داد

سرمد یہودی النسل تھے۔ ایران کے فضلائے حکمت و فلسفہ سے تکمیلِ علم کے بعد اس برِ عظیم میں آئے تھے۔ اس زمانے میں مغل شہزادہ داراشکوہ جو خود صوفی تھا۔ اس کے گرد آزاد خیال صوفیا اور مجذوبوں کا ایک حلقہ ہر وقت جمع رہتا۔ سرمد بھی انہیں میں شامل ہوئے۔ داراشکوہ کی وفات کے بعد مجذوبانہ انداز میں اورنگ زیب کا ماتم کیا کرتے تھے اور اسی سیاست کا شکار ہوئے۔ اگرچہ بظاہر اُن کی شہادت کو خلافِ شرع حرکات اور برہنگی وغیرہ کا سبب بتایا گیا۔ شاہجہان کے سامنے جب داراشکوہ نے سرمد شہید کی تعریف کی۔ تو اس نے عنایت خان کو جو خود بھی صوفی تھا۔ اس مقصد کے لیے بھیجا۔ کہ وہ سرمد کے کشف و کرامات کا حال آکر عرض کرے۔ اُس نے وہاں سے آکر یہ شعر پڑھا ؎

بر سرمدِ برہنہ کرامات تہمت است
کشفے کہ ظاہر ست ازو کشفِ عورت است

عالمگیر کے عہد میں سرمد کی باقاعدہ نگرانی ہونے لگی۔ کہتے ہیں کہ قاضی اور محتسب روز و شب اُن کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ ایک دن انہیں برہنگی کی حالت میں گرفتار کیا گیا۔ قاضی نے کہا۔ فقیر! یہ کیا حرکت ہے۔ کپڑے کیوں نہیں پہنتا۔ سرمد نے کہا کہ بابا کیا کروں۔ شیطان قوی ہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ قاضی کا نام بھی عبدالقوی تھا۔ سرمد کو برہنگی کے جرم میں قتل کر دیا گیا!!

سرخوش کہتا ہے۔ کہ ایک دن میں ناصر علی سرہندی اور مرزا عبدالقادر بیدل دلی کی

مسجد میں حوض کے کنارے بیٹھے شعر پڑھ رہے تھے۔ کہ سامنے سے سرمدآئے۔ ہمیں دیکھکر ہنس دئے۔ اور یہ شعر پڑھا ؎

دیر است کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

دوسرے روز شہید ہو گئے۔ یہ شعر بھی انہیں دنوں کہا ؎

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با من یار بود
قصہ کوتہ کرد ورنہ دردِ سر بسیار بود

کہتے ہیں کہ جب جلاد شمشیر بکف اُن کے سامنے آیا۔ تو اُسے دیکھکر کہا۔ کہ (تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا می شناسم) اور یہ شعر پڑھکر گردن جھکادی ؎

شورے شد واز خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شبِ فتنہ غنودیم

جہاں تک رباعی کہنے کا تعلق ہے۔ برِعظیم کے فارسی شعراء میں سرمد شہید کے پائے کا رباعی گو شاعر آج تک پیدا نہیں ہوُا۔

رباعی شاعری میں سب سے چھوٹی نظم ہے۔ جو کسی معین موضوع پر لکھی جاتی ہے۔ یہ نظم کی مختصر سی صِنف ہونے کے باوجود اس کوزے میں سمندر بند ہوتا ہے۔ دقیق فلسفیانہ خیال باریک سے باریک صوفیانہ مسئلہ نازک ترین اخلاقی نکتہ ان چار مصرعوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ صِنف صرف شاعر کے ایک تصور کو ظاہر کرتی ہے۔ اُسے حُسنِ خیال کی ایک لطیف جھلک یا پرتوِ جمال کا ایک نقشِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہے۔ فنی حیثیت سے رباعی اصنافِ سخن میں مشکل ترین صِنف اور اپنی اصطلاحی خصوصیات جیسے قافیے کی ترتیب وزن کی تکمیل اور آرٹ یعنے خیال کو موزوں جامہ پہنانے میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ رباعی کے پہلے مصرعہ میں مضمون کو روشناس کیا جاتا ہے۔ بعد کے دو مصرعوں میں نشوونما دے کر آخری مصرعہ میں اس کو اختتام تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ تمام مراحل نہایت نازک اور دشوار گذار ہوتے ہیں۔ شاعر کو نہایت اختصار اور سمجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا ہے۔

سرمدفن کے نازک مراحل سے خوب واقف ہیں۔ اور اس اعتبار سے کامیاب رباعی گو ہیں یہ خیال کہ خدا تعالےٰ کو اپنے بندوں سے محبت ہے۔ وہ خود انسان کی جستجو میں ہے اس کا ظہور آدمیت کی تکمیل سے ہے۔ اس خیال کو کس قدر اختصار سے ایک لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

سرمد اگرش وفاست خود می آید　　گر آمدنش رواست خود می آید
بیہودہ چرا در پئے او می گردی　　بنشیں اگر او خداست خود می آید

سرمد کی رباعیات میں کبھی کبھی خیام کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جن میں سرمد جام و مینا سے کھیلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سرمد کہ زمام عشق مستش کردند　　بالا بردند و باز پستش کردند
می خواست خدا پرستی و ہشیاری　　مستش کردند و مے پرستش کردند

اور کبھی سیدھی سیدھی عاشقی اور معاملہ بندی کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ جن میں تغزل کی روح اوج پر نظر آتی ہے۔ زبان صاف سلیس اور رواں دواں استعمال کرتے ہیں۔

دل باز گرفتار نگارے شدہ است　　در فکر و غمِ لالہ عذارے شدہ ست
من پیر و دلم ذوقِ جوانی دارد　　ہنگامِ خزاں جوشِ بہارے شدہ ست

سرمد کا تصورِ حسنِ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ان کا عشق جنسی خواہشات سے مبرّا ہے۔ وہ ضعیف اور فانی محبوب کی بجائے قوی اور باقی محبوب کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ ان کا محبوب حقیقی ہے۔ جو ہر شے پر قادر ہے۔ سب ہی کچھ دے سکتا ہے۔ اور سب ہی کچھ چھین سکتا ہے۔

نے سرو قدے کہ رو نماید یار ست　　نے سیمبرے کہ زور باید یار ست
آن یار گزیں کہ ہرچہ خواہی بدہد　　یارے کہ بکارِ تو آید یار است

اسی محبوب حقیقی کے دیدار کے بغیر دنیا اور دین دونوں ایسچ ہیں ؎

منزلِ حافظ کنوں بارگہِ کبریاست

دنیا نہ کنم طلب کہ کمتر زخس ست　　بے دولتِ دیدار تو دیں ہم ہوس ست

خواہاں وصالم وہمیں ست سخن   درخانہ اگر کس ست ہمیں قدربس ست

ان کی رباعیوں میں خاص طور پر ایک خوبی ہے۔ وہ قدرتی چشمے کی طرح بہت صاف اور رواں ہیں جنہیں قال کی بجائے حال کی زبان سے ادا کیا ہے۔

از نقش برآب ہرچہ گفتم گفتم
وزجوشِ حباب ہرچہ گفتم گفتم
زیں بعد زمن شعر خیالے ست محال
ایامِ شباب ہرچہ گفتم گفتم

آخر میں حضرت سرمد شہید رح کی ایک نصیحت سُنیئے۔ آپ فرماتے ہیں۔ پیری کے زمانے میں انسان کو خدائے تعالےٰ کے فیض چمن سے خوشہ چینی کرنی چاہیئے۔

ہر روز بہ دریائے ہوس گردابی
از ظلمتِ غفلت ہمہ شب در خوابی
ایام جوانی شد وپیری آمد
وقتست کہ از فیض چمن دریابی

بیا تا گل بیفشانیم

ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو دہلوی

تُرکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے نام سے مشہور ہے۔ امیر خسرو اسی قبیلے میں پیدا ہوئے۔ نام ابوالحسن اور لقب یمین الدین ہے۔ چنگیز خان کی غارت گری کے زمانے میں ان کے والد سیف الدین محمود شہر کش سے بھاگ کر بلخ کے موضع (بیسان چارک) میں اقامت گزیں ہوئے۔ گردشِ زمانہ نے یہاں بھی رہنے نہ دیا۔ آخر کابل کی جانب ہجرت کی۔ اُن کی پیدائش اسی علاقے میں ہوئی۔ چنگیز خان جب کابل کی جانب متوجہ ہوا۔ تو امیر سیف الدین محمود اپنے خاندان سمیت ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے سلطان محمد تغلق شاہ کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی۔ سلطان نے نوازا۔ اور کچھ علاقے کی حکومت حوالہ کی۔ سیف الدین پچاسی برس کی عمر میں شہید ہوئے۔ امیر نے باپ کا مرثیہ لکھا۔ اس کا ایک شعر سنیئے۔

سیف از سرم گذشت و دلِ من دو نیم ماند
دریائے من رواں شُد و دُرِّ یتیم ماند

ابتداء میں سلطانی تخلص کرتے تھے۔ اگرچہ امیر کی عمر کا اکثر حصہ درباری تعلقات میں گذرا لیکن باوجود امارت اور شان وشوکت کے نیکو کاری اور بے آزاری کو دستور العمل بنایا۔ مذہب صوفیانہ اور بے تعصب رکھتے تھے۔ تمام عمر ریاضت اور عبادت میں مشغول رہے۔ اس دور کے مشہور اور عدیم المثال ولی حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیآء کے مرید تھے۔ میں نے اپنے حضرت شیخ سے سُنا۔ کہ خسرو ایسے فنا فی الشیخ ہو چکے تھے۔ کہ جب کبھی امیر کو بخار ہوتا۔

تو نظام الدین اولیاء کو بھی فوراً بخار ہو جاتا۔ پیر و مرشد کی جانب سے انہیں ترک اللہ کا خطاب ملا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

برزبانت چونکہ نامِ بندہ ترک اللہ رفت / دست ترک اللہ بگیر و ہم باللہش رساں

جس دن حضرت محبوب الٰہی کی بیعت اختیار کی۔ مال و منال میں سے جو کچھ پاس تھا۔ سب قدموں پر رکھدیا۔ اور خانقاہ کی مدح میں دو شعر لکھے۔!!

جدارِ خانقاہِ او بتقدیم / حطیم کعبہ را ماند بہ تعظیم
ملک کردہ بسقفش آشیانہ / چو اندر سقفہا گنجشک خانہ

ارادتمندی کا یہ عالم تھا۔ کہ حضرت محبوبِ الٰہی ہمیشہ فرماتے تھے! الٰہی اس ترک بچہ کے سوز دل کا واسطہ میرے گناہ بخشدے۔ اور ان کے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب بچپن میں اُن کے کپڑے بدلتے تھے۔ تو کپڑوں میں قلب کے مقام پر ایسا داغ پڑ جاتا۔ جیسے جلے ہوئے کا نشان۔

اس سے پیشتر کہ اس آفتابِ کمال کی شاعری کے متعلق کچھ کہا جائے۔ مولنا جامی رحنے جو الفاظ بہارستان میں ان کے متعلق لکھے ہیں، سُن لیجئے۔ امیر خسرو در شعر تفنن۔ قصیدہ۔ غزل و مثنوی را ورزیدہ ہمہ را بکمال رسانیدہ تتبع خاقانی میکند ہر چند در قصیدہ بہ وے نہ رسیدہ۔ اما غزل را ازوی گذرانیدہ۔ ملا عبد الغنی صاحب میخانہ فرماتے ہیں۔ منظوماتِ دلاویز آن دیباچۂ فصاحت آتشِ شوق در جانِ عاشقان و عارفان می زند و وارداتِ شور انگیز آن طوطی شکرستان بلاغت نمک بر جراحت محد و جان۔ تیغ عشق محاپاشد۔ طوطئ ہند جوانِ کا خطاب ہے۔ ایرانی بھی انہیں اسی خطاب سے یاد کرتے ہیں۔

بہ روحِ خسرو ازیں فارسی شکردارم / کلام طوطئ ہندوستان شود شیریں

حافظ شیراز فرماتے ہیں۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند / زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

غزل کا سب سے بڑا نقص یہ ہے۔ کہ اُس میں مسلسل خیالات ادا نہیں کئے جاتے۔

معاملات حسن وعشق میں تفصیلی واقعات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بلکہ غزل علیحدہ علیحدہ مضامین کی وجہ سے اضداد کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس امیر کے ہاں سینکڑوں غزلیں ایسی ہیں۔ جو واردات حسن وعشق کے اعتبار مسلسل کہی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر عاشق بادِ صبا کو مخاطب کرتے ہوئے محبوب کا حال پوچھتا ہے۔ میرا محبوب کہاں ہے۔ کیا کرتا ہے۔ کن کن لوگوں کے پاس بیٹھتا اٹھتا ہے۔ کبھی اس محفل میں میرا ذکر بھی آتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔!!

اے بادِ صبا باز بہ من گوئی کہ جانان چوں است	آں گل تازہ وآں غنچۂ خنداں چوں است
چشم بدخوش کہ ہشیار نہ باشد مست است	چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں است

شعراء عموماً اپنے اظہارِ جذبات کے لیے عام بول چال کی زباں سے زیادہ مشکل زبان استعمال کرتے ہیں جسے علمی زبان کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اصلیت اور واقعیت کے خلاف ہے غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال کی زبان ہونی چاہیئے۔!! کیونکہ عاشق ومعشوق علمی زبان استعمال نہیں کرتے۔ فرخی۔ سعدی اور امیر خسرو نے خاص طور پر اس کا خیال رکھا ہے۔

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی	عاقبت رفتہ ہماں گفتۂ من پیش آمد
بوئے خوشم آید از تو در جیب	گل داری یا ہمیں است بویت

مجھے تیرے گریباں سے ایک خوشبو آ رہی ہے۔ سبحان اللہ کیا اندازِ بیان ہے۔ ایک اور غزل ملاحظہ فرمایئے۔

لبش در شکر خندہ جاں میبرد	شکیب از منِ ناتواں میبرد
پیالہ بکف چوں رواں می شود	دلِ عاشقاں در رواں میبرد
گرم پرسد از بردن دل کسے	اشارت کنم کاں جواں میبرد
سر زلف کاید ہمی بر لبش	نمک را ز ہندوستاں میبرد
کمر بستہ در دل دروں میبرود	پس آنگاہ جاں از میاں میبرد

امیر کے کلام میں والہانہ شیفتگی اور دیوانگی۔ برق ورعد، جوش اور شعلے

اِسس قدر موجود ہیں۔ کہ اُن کا ہر شعر سرتا سر جوش و اثر میں ڈوبا ہُوا ہے۔ جذب وتحیر کی تصویر ہے۔ سوز و گداز کے مضامین جب بیان کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔

سلامِ خدمتِ ما اے صبا بیار بگوئے
فغاں و زاری بلبل بنو بہار بگوئے

برفت قوتِ عقل و نماند طاقتِ صبر
بگوے زحال من اورا و زینہار بگوئے

زخون دیدہ ہمہ دست من بکار گرفت
مگر کہ دست بگیرد مرا نگار بگوئے

ہزار جور کشیدم ز غم کہ نتواں گفت
یکے اگر بتوانی از اں ہزار بگوئے

اگر ز بندہ فراموش کرد یادش دہ
وزیں دو سہ سخن از وجہ یادگار بگوئے

امیر غزل میں سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ وہی سادگی وہی بے تکلفی وہی بانکپن جذبات حسن وعشق کی ادائیگی کے لیے وہی زبان جس میں عاشق ومعشوق راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ وہی قریب الفہم خیالات۔

گلِ نو رسید و بوئے ز بہارِ من نیامد
چکنم نسیم گل را چو ز یار من نیامد

دلِ من چرا چو غنچہ نشود دریدہ صد جا
کہ صبا رسید و بوئے ز بہارِ من نیامد

ہمہ عمر تشنہ مردم بہوائے آبِ حیواں
کہ جز آبِ شور دیدہ بکنارِ من نیامد

منم و خرابہ و غم ز خوشی خبر ندارم
کہ از اں دیار مرغے بدیارِ من نیامد

بشبِ نشاط یارا چہ خبر تر از خسرو
کہ بجانبِ تو روزے شبِ تارِ من نیامد

امیر کا دعویٰ ہے۔ کہ انہوں نے سیکڑوں تشبیہیں ایجاد کیں۔ بیشک یہ دعویٰ بجا ہے۔ ان کے کلام میں ہزاروں جدید تشبیہیں نظر آتی ہیں۔ ایک مقام پر صحرا کو کفِ دست سے تشبیہ دی ہے۔ لالہ کے سینکڑوں جام صحرا کے ہاتھ میں ہیں۔

ہست صحرا چوں کفِ دست و بر داز لالۂ جام
خوش کفِ دستے کہ چندیں جام صہبا بر گرفت

امیر خسرو علم موسیقی میں حکمی مہارت رکھتے ہیں۔ موسیقی پر کئی رسالے لکھے ہیں۔ ترانہ انہیں کی ایجاد ہے۔ موسیقی میں نایک کا خطاب اُن کے بعد پھر کوئی حاصل نہ کر سکا۔ حضرت نظام اولیاء کو سنانے کے لیے کئی ساز خود بجاتے تھے۔ ہندی راگوں کے ساتھ انہیں فارسی راگوں سے بھی واقفیت تھی۔ انہوں نے ہندی اور فارسی موسیقی کو ترکیب دے کر ایک نیا عالم پیدا کیا۔ حضرت امیر اپنے حقیقی محبوب شیخ المشائخ نظام الدین اولیاء کے انتقال کے بعد چھ مہینے تک زندہ رہے۔ یہ عرصہ درد فراق و بے قراری میں گذرا۔ اسی حالت میں ۱۷ یا ۱۸ شوال ۷۲۵ھ میں وصال ہوا۔ اور اپنی دیرینہ تمنا کے مطابق اپنے محبوب کے پائیں میں حیاتِ جاودانی حاصل کر کے دنیائے شعر و نغمہ کو ہمیشہ کے لیے سوگوار بنایا۔

مولانا شہاب الدین نے ان کی تاریخ کہی۔ اور خود لوح مزار پر لکھوائی۔

شُد عدیم المثل یک تاریخ آن دگرے شد طوطی شکر مقال

بیا تا گل بیفشانیم

خوشحال خان خٹک

د مردانو په معراج به ورتلے نشی   چه د سعی کوتاهی لری په زړه کښے

جس کے دل میں حصول مقصد کے لیے سعی کی کوتاہی ہو۔ مردانِ کمال کے معراج کو حاصل نہ کر سکے گا!! — یہ ہے پیغام افغان قوم کے شمشیرزن شاعر خوشحال خان خٹک کا۔ پشتو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچانے کے ساتھ ساتھ خوشحال خان نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ایک غزل سنیئے۔!!

این رُخ و زلفِ سیہ خم بخم ست   دستۂ سنبل و نسرین بہم ست

لالہ ہر چند کہ زیباست بباغ   پیشِ رخسارِ تو بسیار کم ست

غم ازان نیست کہ میرم بہ اجل   گر ز تیغ تو بمیرم چہ غم ست

بجز از من بہ کسے جور مکن

زانکہ جور تو سراسر کرم ست

خوشحال خان۔ مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہدِ زرین ربیع الثانی سنہ ۱۰۲۲ ہجری مطابق سنہ ۱۶۱۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کا والد شہباز خان حکومتِ مغلیہ کا منصبدار اور قبیلہ خٹک کا سردار تھا۔ خوشحال خان پشاور سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر اکوڑہ خٹک نام ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں دریائے کابل کے جنوبی کنارے شاہی سڑک پر واقع ہے۔ اکوڑہ خٹک کا یہ گاؤں اس کے دادا ملک اکوڑی ولد ملک درویش محمد عرف چنجو نے آباد کیا تھا۔

اگرچہ خوشحال خان کی قسمت میں ایک بلند پایہ شاعر معتبر عالم و مصنف ہونا لکھا تھا۔ مگر جیسا کہ وہ خود ہمیں بتاتا ہے۔ وہ مکتب میں وہ کچھ حاصل نہ کر سکا۔ جو

اُسے حاصل کرنا چاہئیے تھا۔ اس کا وقت زیادہ تر سیر و شکار کی نذر ہوتا۔ اُس نے بعد میں بہت کچھ مطالعہ اور ذاتی تجربات و مشاہدات سے حاصل کیا۔ اگرچہ مدرسے کی پابندیوں کا خوگر نہ ہوسکا۔ لیکن شکار کی طرح کتاب کی محبت بھی اس کی طبیعت ثانی بن چکی تھی۔ کتاب آخر وقت تک اُس کے ساتھ رہی جیسے کہ وہ خود کہتا ہے۔ "اگرچہ سفید داڑھی نے مجھسے جوانی کی رعنائیاں چھین لی ہیں لیکن تین چیزوں سے مجھے بلاکم و کاست ویسے ہی عشق ہے۔ شکار۔ کتاب اور صحیفۂ حُسن" ـــ!!

خوشحال خان کہتا ہے۔ کہ میں نے بیس سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے۔ اس حساب سے اس کی شاعری کی تاریخ ۱۰۴۲ھ ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ خوشحال خان کی شاعری کی امتیازی خصوصیت اس کی قومی۔ وطنی اور ملی شاعری ہے ـــ وہ افغانوں میں پہلے قومی شاعر کی حیثیت سے جانا پہچانا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اُس کی پشتو شاعری کا تعلق ہے۔ وہ ہر حیثیت سے جامع ہے۔ حیات و فکرِ انسانی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو۔ جس کی عکاسی نہ کی گئی ہو۔ وہ ایک حکیم اور فلسفی شاعر ہے۔ اُسے اپنی قوم کی تمام خوبیاں اور اخلاقی کمزوریاں اچھی طرح سے معلوم ہیں بحیثیت ایک حکیم کے وہ قوم کی بیماریوں کا علاج تجویز کرتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ جزویات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ اگرچہ اُس کی تمام عمر جنگ و جدل میں گذری۔ لیکن انسانی نفسیات کا کوئی ایسا پہلو نہیں، جس پر اس کی نظر نہ پڑی ہو۔

لیکن باوجود ان کمالات کے ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ کہ وہ عالمگیر اورنگ زیب رح جیسے ایک متقی اور صالح بادشاہِ وقت کے ساتھ قومیت اور وطنیت کے غیر اسلامی نظریئے کو لیکر برسرِ پیکار رہتا ہے۔ جو سراسر اسلامی نظریۂ حیات کے خلاف ہے۔ اور نسل و رنگ کے اُن بتوں کو دوبارہ زندہ کرتا ہے۔ جنہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور اُن کے غلام ذلت کی گہرائیوں میں دفن کرچکے تھے۔ یہاں مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آیا۔

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به او نرسیدی تمام بولہبی است

به اعتبار فارسی شاعر کے اگرچہ خوشحال خان کو وہ مقام حاصل نہیں کہ اُسے فارسی کا زندہ جاوید شاعر کہا جا سکے۔ لیکن ایرانی تہذیب و تمدن کی ہمہ گیری ایرانیوں کے فلسفہ اخلاق و تصوف، اُن کے ادب اور فنونِ لطیفہ سے اس دور کا کوئی ہمسایہ ملک متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تو پھر اتنا بڑا مفکر و عظیم شاعر کیسے دامن بچا سکتا تھا۔ خوشحال نے بھی حافظؒ و سعدیؒ کی زبان میں شعر کہے۔ اور اسی انداز کو اپنانے کی کوشش کی ۔!!

از و دل برگرفتن کارِ من نیست   کہ از جاں سیر گشتن کارِ تن نیست
چمن را اگرچہ گلہا بس شگرف است   ولے ہمچو رُخت گل در چمن نیست
مرا گوئی بگو وصفِ دہانم   چگویم چوں درو جائے سخن نیست
من و سودائے رویت تا کہ ہستم   اگرچہ خود ترا پروائے من نیست
غمت تا در دل و جانم وطن کرد   مرا در کوچۂ شادی وطن نیست

چرا خوشحال را پرسی کہ چونی
مگر از چہرہ حالش مبرہن نیست

خوشحال خان فارسی میں خوشحال اور کوہی دونوں تخلص استعمال کرتا ہے۔ لیکن فارسی غزلوں میں کوہی زیادہ استعمال کیا ہے۔ خوشحال فارسی شعر کہتے ہوئے کبھی حافظِ شیراز کی طرح جام و مینا سے کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی سعدی کی طرح رازِ درونِ سینہ لیے ہوئے کوچہ و بازار میں پھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

چشمِ مخمور تو آخر کار کرد   زاہدِ صد سالہ را میخوار کرد
در درونِ سینہ رازِ عاشقان   عشق اندر کوچہ ہا اظہار کرد
روئے زرد و آہِ سرد و چشمِ تر   عشق کوہی را چنین بیمار کرد

خوشحال خان چھوٹی بحروں میں زیادہ لکھتا ہے۔ زبان صاف سلیس اور رواں دواں ہے۔ ملٹن کے ہاں شعر کی تعریف سادگی اور بانکپن ہے۔ اسی غزل میں سادگی اور سلاست ملاحظہ فرمائیں۔

لبست از آبِ حیوان آب بُردہ — رخت نور از رخ مہتاب بردہ
ندانم در دو چشم او چہ جادو ست — کہ از چشمانِ عاشق خواب بردہ
بتابِ زلف و پیچا پیچ گیسو — صبوری از دل بیتاب بردہ
گر آن بُت را چو محراب ست ابرو — من او را سجدہ در محراب بردہ

نہ تنہا دل ز خوشحالِ خٹک بُرد
کہ زہد از دستِ شیخ و شاب بُرد

خوشحال خان نے فارسی شعروں میں پشتو کے الفاظ سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بعض اشعار میں پشتو کے قافیوں کے ساتھ اس خوبی سے باندھا ہے کہ کوئی خاص اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس پشتو لفظ کے سوا گو یا دوسرا کوئی قافیہ یہاں زیب ہی نہیں دیتا۔

دا ﷲ بہ چشم بنشیں اے شاہِ خوبانِ چگل — لمعۂ خورشید را بر چشم باشد حائے تل

یا مثلاً یہ غزل ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں قافیہ اور ردیف دونوں پشتو ہیں۔

بگرد کوئے تو گشتی مرادنہ ماد ے — بود کہ روئے تو بینم کہ کعبہ ماد ے
نمی شوم متحمل بروز وعدہ وصل — بیا بیا کہ دلم خوار و زار بے تاد ے
منم کہ غیر ترا در جہان سرے یابم — خلاف نیست خبردار حق تعالےٰ د ے
گمان مبر کہ بگردد ز عشقِ تو خوشحال — چرا کہ بر رُخِ خوبِ تو ڈیر شیدا د ے

یہ پٹھان مجاہد آخر حیرت انگیز علمی ادبی اور سیاسی کارناموں کے بعد ۲۸ ربیع الثانی بروزِ جمعہ ۱۱۰۰ھ اٹھتّر سال کی عمر میں دنیائے ادب کو ہمیشہ کے لیے سوگوار بنا کر عالمِ جاودانی کو سدھارا۔ اس کے بیٹے گوہر خان نے تاریخ لکھی۔

چوں ز تاریخ فوت خان خبرم — شد۔ ز ما رفت زیں جہاں پدرم
۱۱۰۰ھ

خوشحال خان کی لاش کو اکوڑہ خٹک سے کچھ فاصلہ پر بمقام اسوڑی سپردِ خاک کیا گیا۔

پشاور کی ایک گلی

پشاور زمانہ قدیم سے بڑے بڑے عالموں فاضلوں ادیبوں شاعروں وغیرہ کا مولد اور مسکن رہا ہے۔ محلِ وقوع اور جاذبِ توجہ ماحول کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ ان قافلوں کی جائے قیام رہا۔ جو درۂ خیبر کے راستے ہندوستان آئے۔ ایرانی حملہ آور ہمیشہ یہاں سے تازہ دم ہو کر اٹک پار کرتے رہے۔ اسی باعث برِ عظیم ہند و پاکستان میں سب سے زیادہ ایرانی النسل پشاور میں آباد ہوئے۔ اس شہر کا مرکز اور سب سے بڑا اور پُر رونق بازار قصہ خوانی ہے۔ جہاں آج بھی ایرانی تہذیب کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

قصہ خوانی سے کابلی دروازے کی طرف جاتے ہوئے ایک گلی دہنی طرف مڑتی ہے۔ یہاں سے کوچہ رسالدار شروع ہوتا ہے۔ پشاور کی تاریخ میں علم ادب اور موسیقی کے اعتبار سے اس کوچے کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ اسی کوچے میں فارسی اور اُردو زبان کے محسن شعراء اور ادیب پروان چڑھے۔ اس گلی میں شعر و ادب کا آغاز غلام حیدر مسگر کی دکان سے ہوا۔ اسی گلی کی نکڑ پر ان کی دکان تھی۔ جہاں آج حجام اور گلفروش بیٹھتے ہیں۔ مسگر کی دکان پر ہر وقت شعراء کا جمگھٹا رہتا۔ مسگر خود ناخواندہ تھے لیکن شعر گوئی کا ایسا ملکہ تھا۔ کہ بڑے بڑے پڑھے لکھوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ سہ حرفی کے بادشاہ سائیں احمد علی بھی شب و روز اس دکان پر بیٹھتے۔ مسجدی شاہ خادم، مرزا علی محمد۔ دلاور خان۔ بیدل۔ خالص کی۔ برق گنجوی۔ جگر کاظمی رفعت بخاری اور قاضی محمد عمر قضا۔ اس دور کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ سائیں احمد علی اور مسگر کی کوششوں سے ان منتشر قوتوں نے اجتماعی شکل اختیار کی۔ اور بزمِ سخن کے نام سے ۱۹۰۳ء میں ایک ادبی مجلس بنائی گئی۔ بزمِ سخن کی تشکیل کے ساتھ ہی پشاور کی تاریخ ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ شہر پر تو جو اثر

ہوناتھا، وہ ہُوا۔ لیکن کوچہ رسالدار کے رہنے والوں میں ایک خاص زندگی نظر آنے لگی۔ ادب کے لیے ایک جذبہ پیدا ہُوا۔ ہر طرف شعروادب کا چرچا ہونے لگا۔ نئے عزم اور انتھک ارادوں سے اربابِ بزمِ سخن نے کام شروع کیا۔ عوام کے تعاون سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔

مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ جن میں فارسی اور اردو کے مصرعِ طرح کے لیے دئے جاتے۔ بیلی رام آشفتہ اور نادر قنوجی بھی ان دنوں پشاور ہی میں رہتے تھے۔ نادر قنوجی داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ برق گنجوی ضامن علی جلال کے شاگرد تھے۔ قاضی محمد عمر قضا داغ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے تھے۔ ان حضرات کے دم قدم سے بزمِ سخن کو وہ عروج حاصل ہُوا۔ جس کی نظیر پشاور کی تاریخ ادب میں نہیں ملتی۔ مسجدی شاہ خادم جو تاریخ نکالنے میں یکتائے زمانہ تھے۔ اور آغا میر عباس آمیر لعل شاہ جگر بسری خالص کی فارسی کہنے والوں میں پیش پیش تھے۔ سائیں احمد علی سرحدی کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ مشاعروں میں اپنے شاگردوں کے ساتھ آتے تھے۔ تمام محفل پر چھا جاتے۔ مشاعرے کی تیاری ہفتہ عشرہ پہلے شروع ہوتی۔ گلی کے دونوں سروں پر مصنوعی دروازے بنائے جاتے۔ جن پر اردو فارسی قطعات لکھے جاتے تھے۔ اور فارسی اساتذہ کی خوشنما تصویریں لٹکائی جاتیں۔ چوراہوں پر جھنڈیاں لگائی جاتیں۔ مشاعرہ گاہ میں چائے سوڈا پان سگرٹ کی عارضی دکانیں کھولی جاتیں۔ کتابوں کے سٹال لگتے۔ ان پر علمی ادبی کتابوں کے علاوہ مشاعرے کا منتخب کلام رسالے کی صورت میں فروخت کیا جاتا۔ مشاعرے کا انتظام سنبر علی خان کی وسیع اور عریض سرائے میں کیا جاتا۔ خان موصوف خود بھی کبھی کبھی شعر کہتے۔ سرائے کے احاطہ میں قالین اور صوفے بچھائے جاتے۔ صدارت کے لیے زمین پر مسند بچھائی جاتی۔ شعراء اور سامعین کی تواضع موسم کے مطابق چائے اور شربت سے کی جاتی۔ عالی جناب سردار عبدالرب خان نشتر، جوان دنوں جوان تھے۔ شعر کا نیا نیا مذاق پیدا ہُوا تھا۔ کالی دوپلی ٹوپی اوڑھ کر آتے۔ فارسی اُردو میں خوب کہتے۔ ان دنوں میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ لیکن

مجھے یاد ہے۔ کہ شعر کا اثر میرے دل پر کچھ عجیب طرح سے ہوتا۔ مشاعرے کے طرحی مصرعے اور کئی اشعار یاد ہو جاتے۔ اسلامیہ کالج کے اکثر پروفیسر اور دوسرے حضرات بھی حصہ لیتے۔ اور جب کبھی کوئی تھیٹریکل کمپنی پشاور آتی۔ تو مشاعروں کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ غلام علی دیوانہ، شمس گیاوی۔ رحمت علی رحمت تھیٹر کی جانب سے نمائندگی کرتے۔ سبز علی خان کی سرائے بٹیر بازی اور مرغ لڑانے کے لیے بھی مشہور تھی۔ اتوار اور جمعہ کو بٹیر بازوں اور مرغ بازوں کا ایک ہنگامہ رہتا۔ اور گھنٹوں اس شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ اسی کوچے میں ایک عجیب و غریب شخصیت کا حجام رہتا ہے۔ جو لبِ جو ایک چٹائی بچھا کر حجامتیں بناتا یہ حجام آج بھی زندہ ہے۔ اس کا نام تو یاد نہیں۔ لیکن اب اس میں وہ کس بل نہیں۔ یہ حجام جو اصل میں ایک مُلا تھا۔ چار ابرو کا صفایا کئے اور ہر وقت مسکراتے ہوئے حجامتیں بناتا تھا۔ اس ملا کو مثنوی مولانا روم رح ازبر ہے۔ مثنوی کی کوئی حکایت پوچھئے فوراً پڑھ کر سناتا ہے۔ یہ ایک جامن کے درخت کے نیچے چٹائی بچھا کر کام کرتا۔ اور اس جامن کے درخت پر رات کو سو رہتا۔ جامن کی ٹہنیوں میں اوپر کی چوٹی پر ایک چارپائی اوندھی لٹکائی تھی۔ جس پر نرم گھاس بچھی رہتی۔ گھاس پر اس کا صاف بستر بچھا رہتا۔ ایک زنگ بھی رسیوں سے بندھا ہوا درخت سے لٹکا رہتا۔ حجام پاؤں سے لنگڑا ہونے کے باوجود سرِ شام نہایت چستی اور تیزی سے درخت پر چڑھتا۔ کھانا وغیرہ وہیں لے جاتا۔ پانی کا برتن بھی ساتھ ہی لٹکا رہتا۔ جامن کا درخت اور چارپائی اس کا گویا مکان تھا۔ حجام شعراء سے شعر و ادب پر اکثر گفتگو کرتا۔ فصیح اردو بولتا۔ اکثر مسائل میں الجھتا تو گھنٹوں بحث کرتا۔ پرانے قسم کے دیسی استروں سے لوگوں کی داڑھیاں اور سر مونڈتا۔ اس سے حجامت کرانا ایک صبر آزما کام تھا۔ کیونکہ اس کے اکثر اوزار کند ہوتے تھے۔ داڑھی اور سر منڈھائی کی اجرت صرف دو پیسے لیتا۔ یہ مُلا آج بھی زندہ ہے۔ اسی گلی میں اس نے ایک دکان لے لی ہے۔ خدا معلوم جامن کا یہ درخت کس طرح اکھڑا اور اس کا رین بسیرا تاراج ہو گیا۔ تعجب ہے!

جعفری نابینا شاعر کی دکان بھی اسی گلی میں تھی۔ اس دکان پر بھی شعراء کا جمگٹا رہتا۔ آغہ میر عباس میبر کی دوکان تو شعراء کا اڈہ ہوتا۔ یہ دکان بھی اسی گلی میں ہے۔ سرحد کے بڑے بڑے شعراء اور ادیب یہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ چائے پیتے۔ قہوہ نوشش کرتے تازہ اشعار سناتے۔ ان لوگوں میں فارسی کا مذاق بہت زیادہ تھا۔ اسی دکان پر نظیری اور بیدل پڑھا جاتا۔ ایک ایک شعر پر بحث ہوتی۔ عجیب فراغت کا دور تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ گھنٹوں میر عباس کی دکان پر بیٹھتے۔ یہیں کھاتے۔ یہیں پیتے۔ اور رات گئے تک محفلیں جمائے رہتے۔ پشاور کی یہ گلی ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ اس گلی میں ہر وقت رونق رہتی ہے۔ ایک زمانے میں کھٹے کے کنارے پر ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ جو ہر وقت مطالعہ کرنے والوں سے بھری رہتی۔ اس گلی میں ایرانی النسل لوگ کثرت سے رہتے ہیں۔ ان کے بچے اس گلی میں آج بھی فارسی بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ تمدن اور رہن سہن میں اب تک ایرانی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ ایرانی حضرات اثنا عشری ہیں۔ اس لیے محرم کے ایام میں تو یہاں غیر معمولی رونق رہتی ہے۔ چوک کی بڑی سبیل بھی اسی محلے میں بنتی ہے۔ ایک بڑا امام بارہ جو رسالدار عادل بیگ کے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے۔ اسی گلی میں ہے۔ محرم میں یہ محلہ عزاداران سینہ زنوں اور زنجیرزنوں کا مرکز ہوتا ہے۔ سبیلوں پر مرثیہ خوانی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے علماء روضہ خوانی کرتے ہیں۔ اسلام کے ہر طبقے کے بیدار مغز لوگ ان مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ امام باڑے میں شبیہیں بنتی ہیں۔ علم اور ذوالجناح نکلتے ہیں۔ گلیوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ نذریں پکتی ہیں۔ شربت اور شیرینی بٹتی ہے۔ شعر و ادب کے ساتھ اس گلی میں مرثیہ اور سلام پڑھنے والے حضرات کی بھی کمی نہیں۔ محلِ وقوع کی وجہ سے بھی یہ گلی چونکہ پشاور کے دل یعنی قصہ خوانی کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے بڑا پُر رونق رہتا ہے۔ چاروں جانب راستے نکلتے ہیں۔ لبِ جو جامن کے درخت قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔ درختوں کے سائے میں قہوہ خانہ والوں کی میز کرسیاں بچھی رہتی ہیں۔ دو چار

ریڈیو ہر وقت بجتے رہتے ہیں۔ بے ثباتیٔ زمانہ نے کسے چین سے رکھا ہے۔ آج ان صورتوں کو آنکھیں ترستیں ہیں۔ جو کبھی اس گلی کے لیے باعث رونق تھیں۔ دو ایک ہستیوں کا دم غنیمت ہے۔ جنہیں دیکھ کر اور جن سے مل کر پرانی یاد تازہ کی جاسکتی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند تعالےٰ ان یاد تازہ کرنے والی ہستیوں کو عمر طویل عطا کرے۔ تاکہ ماضی کے نقش مٹنے یا مدھم پڑنے ہی نہ پائیں۔ !!!

ایک خط

یہ غالباً ۲۲ اور ۲۳ اگست ۱۹۶۴ء کی درمیانی شب کا ذکر ہے۔ کہ مجھ سرتاپا عصیاں میں ملوث گنہگار بندے کو حضور سرورِ عالم سید کونین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ ایک صحرائے لق ودق میں کھڑا تھا۔ حضور ایک اونٹ پر سوار تھے۔ آپ نیچے اترے اور مجھے گلے سے لگایا۔ حضور کے قدو قامت کو دیکھ سکا لیکن ان کا چہرہ مبارک نقاب سے ڈھکا تھا۔ میں نے یہ خواب قبلہ آغا جی کو خط میں لکھا۔ جس کا جواب مندرجہ ذیل خط ہے۔ مرتضیٰ جعفری

۷۸۶ ۔ یا محمد مصطفےٰ مشکل کشا بہرِ خدا

اختر تابندہ تابندہ تر باد آمین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سب سے پہلے میری جانب سے مبارک باد قبول کیجئے ؎

گوارا بادت ایں عشرت کہ داری روزگارے خوش۔

یہ خواب سراپا نور و انبساط جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور سرورِ عالم سید ابن آدم سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہیں آپ کو میسر ہوا ہے۔ یہ خواب عینِ حقیقت اور عینِ بیداری ہے۔ سردارِ دوجہاںؐ فرماتے ہیں۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا۔ اس نے مجھ ہی کو دیکھا۔ شیطان میرے لباس میں ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ماں مرحومہ کی خدمت والد کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کے گھر بنانے کے سلسلے میں ایک خاص رابطۂ قلبی۔ مدت کے بعد عرس سرکارِ جیلانی رضؓ میں حاضری اور سب سے بڑھکر اللہ تعالیٰ کی کریمی اس خواب کا سبب اور پس منظر ہو سکتا ہے۔ یہ حدیث بھی سنیئے۔ آقائے مدینہ فرماتے ہیں: مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَ الْحَقَّ۔ جس نے مجھے دیکھا۔ اس نے حق سبحانہٗ تعالیٰ کو دیکھا۔

؎ یہ جو صورت ہے تیری صورتِ جاناں ہو بہو
وہی نقشہ ہے وہی رنگ ہے ساماں ہو وہی

میں ہمیشہ دست بدعا ہوں۔ کہ خدائے تعالیٰ دنیاوی ثروت و عزت کے ساتھ ساتھ آپ کو نورِ باطن اور سوزِ دروں عطا فرمائے۔ کیونکہ سے یک ذرہ دردِ دل از علمِ فلاطون۔ الحمد للہ! کہ اس جانب بھی کچھ کچھ رہ نمائی ہو رہی ہے۔ اس کی ابتداء ہمیشہ انہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ مجھے سرکارِ غوثیت مآب سے چند ماہ پہلے ہی ارشاد ہُوا تھا۔ کہ اختر کی جانشینی کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے سرسری طور پر آپ سے کہہ بھی دیا تھا۔ اور کسی موزوں موقع کی تلاش میں رہا۔ اس خواب میں اونٹ سے اُتر کر سینۂ اطہر سے لگانا کمالِ کرم و اظہارِ شفقت ہے۔ خوشا نصیب اور یہ اشارہ ہے۔ انشاء اللہ اُس نعمتِ عظمیٰ کا جو آپ کے حصے میں آچکا ہے۔ اب سب سے پہلے آپ کو قرآن مجید بلا شرم و حجاب کسی سے شروع کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ یہ نعمت نصیب فرمائے۔ آمین! سحر خیزی کی عادت ڈالیئے۔ اور اس خواب مبارک اور اس کیفیت کا تصور قائم رکھیئے۔ بہر نوع یہ حق تعالیٰ کا سب سے بڑا کرم ہے۔ جو کسی مومن پر ہو سکتا ہے۔ بیٹیا ہمارا تو مذہب بھی یہی ہے۔

قسم بہ قبلۂ روئے تو یا رسول اللہ
رواست سجدہ بسوئے تو یا رسول اللہ   جامیؒ
بود بہ مذہبِ ما حجِ اکبر این معنیٰ
طواف کعبۂ کوئے تو یا رسول اللہ

سجد کو مری میں کیا کرنا تھا۔ یا پھر ایک آدھ شب و روز رہ کر آجاتا تھا۔ بوالپسی لکھیئے کہ وہ آچکا ہے۔ یا اب تک نہیں آیا۔ میں انشاء اللہ ستمبر کی ۲ تاریخ تک آجاؤں گا۔ اور پھر آپ ضرور چند یوم کے لیے ایبٹ آباد آئیے۔ میں یہاں بور ہو چکا ہوں۔ صرف طاہرہ کے بخار نے تشویش لاحق کر دی ہے۔ جمعہ ۲۹ تاریخ کو ممتاز آرہی ہے۔ کل جمعرات کو اجلال حیدر عرف سید علی ترمذی کا عقیقہ ہے۔ مہابت خان ڈی۔ ایس۔ او اور اصغر علی جان، جو یہاں تبدیل ہو کے آچکا ہے۔ دونوں کو مدعو کیا گیا۔ تصویر کھچوا کر بھیج دوں گا۔ یا خود ساتھ لے آؤں گا۔ بہر نوع

کل کا دن بہت مصروف ہے۔ اصغر علی جان آج اپنے بچوں سمیت عصر کے وقت آ گئے تھے۔ کل عقیقہ اور ختمِ کلام مجید کی تقریب پر اس نے پھر آنا ہے۔ اس کے بچے بھی آئیں گے۔ ایبٹ آباد کا موسم خوشگوار ہے۔ لیکن میری طبیعت ناساز ہے۔ کھانسی آ رہی ہے۔ گلا متاثر ہے۔ پراسٹیٹ کی وجہ سے پیشاب بار بار آتا ہے۔ مثانے میں سوزش ہوتی ہے۔ اجمل کے متعلق لکھیں۔ اسے داخلہ ملا ہے۔ یا ابھی تک نہیں مل سکا۔ وہی پیر سرور شاہ صاحب کے فرزند کو میرا پہلا خط مل چکا ہوگا۔ آپ کا چوبیس تاریخ کا لکھا ہوا خط ۲۷ تاریخ شام کے وقت ملا۔ سنایئے بہو بیگم کا کیا حال ہے۔ وہ گھر میں اکیلی گھبراتی ہوں گی۔ اجلال حیدر بخیریت ہے۔ اصغر علی جان کو آپ کا خط دکھایا۔ بڑا متاثر ہوا۔ اس نے پڑھ کر اپنی بیوی کو دکھایا۔ خدائے تعالیٰ اس خواب کی لذت جو بیدار بختی کی نشانی ہے قائم رکھے۔ استاد جی کو دعا۔ عطاء اللہ خان اور دانش صاحب کو دعا۔ سلیم صاحب کو سلام و دعا۔ بہو بیگم کو دعا۔ میں تو راتوں کو اس کے لیے دست بدعا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ کسی وقت اگر تیرِ دعا نشانے پر لگا۔ تو فوراً مشکل حل ہو جائے گی۔ خدائے تعالیٰ اس کی گود ہری کرے۔ خورشید اور قمر صاحب کو دعا۔

ے تو مگو مارا بہ آن شہ بار نیست
از کریماں کارہا دشوار نیست

حیاتِ جعفری اگر آ چکا ہو۔ تو اسے میری جانب سے دعا۔ مودی۔ طاہرہ اور ممتاز سلام و دعا دیتے ہیں۔ تیمور شاہ جمعہ کو پشاور آ رہا ہے۔ سیمنٹ کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ کیا وہ یہ سیمنٹ ایبٹ آباد لے جا سکتا ہے۔

دعا گو سید ضیاء جعفری

انتخابِ کلام

حضور پیکرِ نور

بحضورِ سرورِ کائنات۔ فخر موجودات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

حضور جانِ بہاراں حضور موجِ طہور — تمام روحِ معانی تمام پیکرِ نور
حضور صبحِ تجلّی۔ حضور عینِ ظہور — حضور سلسلۂ انبیار میں نور ہی نور
حضور مہرِ درخشاں حضور ماہِ تمام — حضور ابرِ کرم ہیں حضور جانِ سرور
فدائے نیمِ تبسم۔ متاعِ کون و مکاں — نثارِ زلفِ پریشاں ہزار علم وشعور

حضور نورِ مجسم۔ حضور خُلقِ عظیم
حضور اُمتِ عاصی پہ ہیں رؤف ورحیم

حضور مرکزِ ہستی، حضور جانِ حیات — وہ آئینہ کہ نمایاں ہے جس میں جلوۂ ذات
حضور رحمتِ عالم، حضور ختمِ رسل — بشر کے وہم سے بالاتر آپ کے درجات
نثار عارضِ گلگوں حدیث لالہ و گل — حکایتِ لبِ شیریں وہ کاروانِ حیات
کلیم گنگ ہیں۔ عیسیٰ کو بھی تعجب ہے — زبان آپ کی اور بات ہے خدا کی بات

ہیں آسمانِ نبوت پہ آپ بدرِ منیر
حضور آپ کے حلقے میں مہر و ماہ اسیر

اسیرِ حلقۂ گیسو بہار ہو کہ خزاں — حضور آپ پہ قربان متاعِ ہر دو جہاں
حضور آپ نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے — حضور آپ کے دم سے ہے آب و رنگِ جہان
نہ ہوتا دیرِ خراب اور نہ یہ رباطِ کہن — نہ ہوتا نالۂ ناقوس و نے صدائے اذاں
حضور آپ کے قدموں سے یہ بہار آئی — حضور آپ کا صدقہ ہے بزمِ کون و مکان

حضور حد سے بڑھی داستانِ تشنہ لبی
کرم کرم کہ ہیں سرمست مدعا طلبی

چراغِ بحر و بر علی

بحضور مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

وہ ابر جھوم کر اٹھا۔ چمن چمن شفق کھلا
ذرا تو دیکھ ساقیا نقاب الٹ نظر اٹھا

گل و سمن نے کہدیا ہے رازِ عشق برملا
بڑھا سبو۔ پیالہ لا۔ پلا مجھے مئے ولا

وہ جام جس کی روشنی مہ تمام کو ملی
وہ مے کہ جس کی سرخوشی ہمارے جام کو ملی

وہ مے کہ جب پری بنی تو روح میں اتر گئی
نشہ مئے طہور کا تھا زندگی سنور گئی

زباں پہ بے خودی میں پھر علی کا نام آگیا
ہمارا جام زرفشاں ہمارے کام آگیا

علی و نفسِ مصطفیٰ۔ علی امام اولیاء
علی وہ شیرِ کبریا ہنر بریشۂ دغا

تمام شانِ دلبری۔ تمام جانِ نغمگی
تنِ حسین پہ سج رہا ہے جامۂ ید اللّٰہی

چراغِ بحر و بر علی۔ جمالِ خشک و تر علی
چمن چمن روش روش شجر علی۔ ثمر علی

نشاطِ جان و تن علی۔ جہاں کا بانکپن علی
نظامِ شش جہات میں بنائے علم و فن علی

نسیمِ صبحِ زندگی۔ دل و نظر کی تازگی
میرے بیان و خامشی کی منتہا علی علی

جمالِ دلستاں کہوں، تمہیں میں جانِ جاں کہوں
اس عرشِ آستاں کو پناہ دو جہاں کہوں

ازل کی روشنی کہوں۔ ابد کی زندگی کہوں
تجھے میں اے مہ تمام۔ جملہ زندگی کہوں

خلیفہ خدا علی۔ امامِ دوسرا علی
وصیِ مصطفیٰ علی۔ جمالِ حق نما علی

نظر وہ صبحِ گلستاں۔ کہ موجِ مئے رواں دواں
یہ کاروانِ آہواں کبھی یہاں کبھی وہاں

زباں پہ ذکرِ حق رہا ہے بھوک اور پیاس میں
جبیں رہی ہے سجدہ ریز حمد اور سپاس میں

امامت و ولایت و شہادت ان کے گھر میں ہے
بنائے مس کو کیمیا اثر وہ اس نظر میں ہے

سلام اس پہ جس نے دل کو جاوداں بنا دیا
بس اک نظر سے گردِ رہ کو کہکشاں بنا دیا

ضیاءؔ ترا غبارِ تن جو فرشِ بوتراب ہو
یہ خاکِ آفتاب ہو۔ یہ ذرہ ماہتاب ہو

جنوں میں شہر نگاراں کی سمت آئے ہیں

بتقریبِ عرس سراپا قدس سیدنا و مولانا غوث اعظم سید عبد القادر جیلانی رضہ

ہمارے سینے میں روشن وہ آفتاب ہے آج   مہ و ستارہ و خورشید ہمرکاب ہیں آج
کمند ڈالتے ہیں کہکشاں پہ دیوانے   بڑھے ہیں اختر و پروین کے لیکے پیمانے
یہ خوابگاہ بہاراں کی سمت آئے ہیں   جنوں میں شہر نگاراں کی سمت آئے ہیں
قدم قدم پہ جلا کر عقیدوں کے چراغ   ولا کی شمع فروزاں محبتوں کے چراغ
یہ عرسِ غوث معظم منانے آئے ہیں   دل و نظر کو چراغاں بنانے آئے ہیں
بہار ہو کہ خزاں گلستاں ہے جام ان کا   جبینِ میکدہ پر ضو، فشاں ہے نام ان کا
اڑا کے پرچم گل باد نو بہار آئے   جنابِ پیرِ مغاں پر پئے نثار آئے
جنابِ پیرِ مغاں سے ہے ان کا یارانہ   حضور غوث یہ لائے ہیں دل کا نذرانہ
وہ غوث کعبہ بھی جن کا طواف کرتا ہے   گلِ مراد سے دامن کو اپنے بھرتا ہے۔
وہ غوث جس نے جلائے ہیں آندھیوں میں چراغ   کرے نہ فہم بشر جنکی عظمتوں کا سراغ
فروغ بزم تجلی وہ شاہِ جیلانی   وہ دستگیر دو عالم وہ قطب ربانی
چراغ جس نے جلائے ہیں بزمِ امکاں میں   جو نوح امتِ خیر الامم ہے طوفاں میں
خطت کلیم کلام و رخت کلام اللہ   چہ خط چہ رُخ چہ جبیں لا الٰہ الا اللہ
اسی وجود گرامی سے طور ہے بغداد   تمام نور سراپا حضور ہے بغداد
جناب نذر محی میں ہے بس ان کا ظہور   انہیں کے فیض سے مرقد ہے ان کا شعلۂ طور
جناب نذر محی کا لب پہ نام آیا   تو سرزمینِ بٹالہ سے یہ پیام آیا
یہی ہے حضرت فاضل یہی ظہورِ حسین   یہی ہیں بدر منور یہی ہیں نور العین
انہی کے دامنِ اقدس کی گرد ہیں ہم لوگ   اسی لیے تو زمانے میں فرد ہیں ہم لوگ
جناب ساقیٔ کوثر کا یہ گھرانہ ہے   حضور غوثِ معظم رض کا یہ ٹھکانہ ہے
ضیاء سپاس گذارم ز بختِ خود شادم   بہ زیرِ سایۂ بدر منیر آبادم

الٰہی کرب و بلا ساز خاکِ مدفنِ ما
بود بدستِ حسین شہید دامنِ ما

دیارِ نغمہ و گل

۱۴ر اگست

یہ دن امینِ بہاراں - یہ رات نغمہ و نور
یہ دن کہ اجنبی سائے ہوئے نگاہوں سے دور

اٹھا جنازہ اسی دن سیاہ راتوں کا
یہ شب کہ قافلہ آیا تھا ماہتابوں کا

یہ دن طلوع ہوا ہے مہیبِ فردا سے
یہ صبح ڈوب کے نکلی ہے خون کے دریا سے

یہ دن خیالِ قلندر کا آفریدہ فسوں
کمالِ اہلِ خرد ہے شعارِ اہلِ جنوں

یقیں کی مشعلِ شب تاب لیکے آپہنچی
جواں دلوں کے حسیں خواب لیکے آپہنچی

حیات ڈھونڈ رہی تھی اک انقلاب آئے
وطن کے تیرہ شبستاں میں آفتاب آئے

مچل رہے تھے جو دامانِ شب میں ہنگامے
جگا گیا کوئی شہرِ طرب میں ہنگامے

افق افق کی جبیں پھر ستارہ بار ہوئی
چمن چمن میں شگفتہ نئی بہار ہوئی

مہک گیا گلشن کلی کلی جاگی
روش روش پہ گلستاں میں زندگی جاگی

ہے شور جاگ اٹھی ہے دیارِ شب میں سحر
اک عزمِ نو لئے پھر کارواں ہے گرمِ سفر

ہوئے دوبارہ فروزاں بجھے بجھے سے چراغ
پلا گیا مرا ساقی خود آگئی کے ایاغ

نویدِ زیست لیے نو بنو پیام آئے
بنامِ لالہ و گل صبحِ نو کے جام آئے

پلائے جا کہ اندھیروں میں جام رخشاں ہے
جبینِ میکدہ پر اپنا نام رقصاں ہے

ہے صبحِ نو کا لئے تذکرہ نگاہوں میں
جلا ہے انجم و پرویں کی خوابگاہوں میں

جواں ارادے ہیں ڈالیگا کہکشاں پہ کمند
زمیں پہ چاند اتارے گا اس کا عزم بلند

افق افق پہ تقاضائے نو بنو کی نمود
دیارِ صبح میں ہے شب کا تذکرہ بے سود

یہ اُجلے اُجلے در و بام یہ حسیں کہسار
چمن چمن میں اُجالا دمن دمن میں بہار

قدم قدم پہ مہ و کہکشاں سے آئے ہیں
جو مڑ کے دیکھیے تو آسماں سے آئے ہیں

وطن ہے آج سراپا دیارِ نغمہ و گل
مبارک اہلِ وطن کو بہارِ نغمہ و گل

فیضانِ جنوں

بتقریب عرس مقدس شاہِ جیلاں

دل سوئے رہ گذرِ دوست کھچے جاتے ہیں
قافلے جانبِ لاہور چلے آتے ہیں

کون در پردہ یہ دامن کشِ دل ہے یارو
کہ متاعِ دل و دیں نذر لیے آتے ہیں

آگے آگے ہے کوئی شمع بکف راہ نورد
پیچھے پیچھے ہیں کہ پروانے چلے آتے ہیں

کششِ جذبۂ باطن ہے کہ فیضانِ جنوں
دل کو تڑپاتے ہیں جو روح کو گرماتے ہیں

جانے کس جلوۂ رنگیں کی تمنا ہے انہیں
آپ سے آپ جو دیوانے بنے جاتے ہیں

آ بتاؤں میں تجھے رازِ دروں سترِ نہاں
آسماں پر جو ہُوا گیارہویں کا چاند عیاں

غوثِ اعظم کے گھرانے میں بہار آئی ہے
گل فشاں۔ بادہ چکاں، نغمہ زناں رقص کناں

دیکھ عرس شہ جیلاں کا یہ منظر اے دوست
بن گئی چاند ستاروں سے زمیں کہکشاں

آسمانوں پہ فرشتوں نے منادی کردی
اور فردوس میں ہیں رقص کناں حورِ جناں

نسبتِ قادری احیائے قرآن و سنت
کر کے یہ عزم چلے آئے ہیں سب پیر و جواں

نائبِ ختمِ رسل، جانِ علی، روحِ بتول
شہ زریں کمراں، بادشہ کج کلہاں

زلف و عارض پہ فدا صبحِ چمن شامِ بہار
لوحِ سیما ہے کہ فردوس کی صبحِ خنداں

زلفِ شبگوں ہے کہ میخانہ پہ چھایا بادل
قدِ موزوں کی حکایت لبِ جو سروِ رواں

کاروں اُترے ہیں اِس شہر میں مہتابوں کے
جس جگہ آئے نظر آپ کے قدموں کے نشان

میں کہاں اور کہاں مدحتِ شاہِ جیلاں
گلفشاں آپ کے دم سے ہے میرا حسنِ بیاں

نسبتے با خمِ زلفِ تو مدام است مرا
من گرفتارِ تو ام دل تہِ دام است مرا

ہر زماں از خمِ تو بادہ بجام است مرا
شکر للہ کہ بہ میخانہ مقام است مرا

مہ جیلی بہ تمنائے تو شب تا بہ سحر
نکہتِ زلفِ تو ہر دم بمشام است مرا

من بہ یادے تو نمازے کہ گذارم ہر شب
ہمہ وجد است۔ قعود و نہ قیام است مرا

غوث اعظم تو نہ داری بہ جہانے ہمسر
من و مدحِ تو چہ جا و چہ مقام است مرا

صورت و سیرتِ تو رنگِ نبی رنگِ علی
ذرۂ خاک درت ماہِ تمام است مرا

بدر ما تافتہ بر چرخِ ولایت صد شکر
زانکہ الطاف دپیوستہ مدام است مرا

چوں ضیاء، نذرِ محی پیرِ مغانے دارم
دم بدم از کرش بادہ بجام است مرا

غزلیات

چلو کہ رنگِ زمانہ بدلیں بڑھو بڑھو ہمت آزمائیں
جنوں کی لو اور تیز کردیں فسردہ شمعوں کو پھر جلائیں

یہ قاعدہ ہی سحر سے پہلے عروج ہوتا ہی ظلمتوں کا
مگر اٹھا اے فطرتِ درخشاں چراغِ قلب و نظر جلائیں

خزاں زدہ وادیوں پہ ہر سمت موت منڈلا رہی ہی اب تک
مگر یہ ارشاد ہی کہ اس کو بہار کہہ کر فریب کھائیں

تمہاری خاطر یہ مان بھی لیں خزاں کو رشکِ بہار کہہ دیں
لئے ہوئے گلشنوں کو کیونکر کرشمۂ رنگ و بو سکھائیں

اگر ہے تاریک شب تو چھین قبائے ماہ و ردائے انجم
ہر ایک ذرے میں جگمگائیں۔ دلوں کو پھر دھڑکنیں سکھائیں

سنہری کرنوں کے روپ میں اس سراب کو کہکشاں سمجھ کر
یہ ڈر ہے عصرِ جواں کے راہی غبارِ منزل میں کھو نہ جائیں

بساطِ محفل بدلنے والے پکارتی ہیں تجھے بہاریں
چلو چلو سازِ نو دکھائیں۔ فضا میں نغمے بکھیر آئیں

فرنگ سے لوٹ کر نگاہیں تڑپ کے سوئے حجاز پہنچیں
حیاتِ نو کا پیام لیکر ضیاؔ، حرم سے اٹھیں گھٹائیں

فضا میں پھیلتے جاتے ہیں رات کے سائے
خدا کرے کوئی گاتی ہوئی سحر آئے

ایک ایسا دور بھی آیا ہے۔ دردمندوں پر
فقط خوشی کے تصور سے اشک بھر آئے

تبسمِ لبِ رنگیں کہ جاگ اٹھیں کلیاں
پیام زیرِ لب ایسا کہ پھول مسکائے

ہم اپنی بیکسیٔ غم پہ شب بہت روئے
کھلی جو چاندنی تم بار بار یاد آئے

بہارِ نو کی حکایت ہے لالہ زاروں میں
شرارِ گل سے نہ دامن ترا بھڑک جائے

یہ شبنمی سا بدن پیرہن کے سائے میں
کہ جیسے چاند کسی جھیل میں اتر آئے

یہ کارواں بھی ہراساں یہ رات بھی تاریک
جو تیرگی ہو مسلسل کوئی کدھر جائے

غمِ جہاں غمِ جاناں بنا دیا کس نے
حیات و موت کو یکساں بنا دیا کس نے

تبسم لبِ رنگیں کہ جاگ اٹھیں کلیاں
نظر نظر کو گلستاں بنا دیا کس نے

یہ کس کی پلکوں پہ تارے لرز لرز اٹھے
افق افق کو چراغاں بنا دیا کس نے

خنک ستاروں کی چھاؤں میں رات چھپ چھپ کر
دل و نظر کو فروزاں بنا دیا کس نے

طلوع یہ کون ہوا میکدے سے جام بکف
مہ و ستارہ کو رقصاں بنا دیا کس نے

نشے میں کھول دئے کس نے تا کمر گیسو
یہ نکہتوں کو پریشاں بنا دیا کس نے

وہ صبح نو نے نگاہوں میں لی ہے انگڑائی
یہ ظلمتوں کو چراغاں بنا دیا کس نے

ادائے خاص سے یہ التفاتِ پرسشِ غم
گدائے راہ کو سلطاں بنا دیا کس نے

یہ کس کی آنکھوں میں نغموں کے در کھلے ہیں ضیا
فضا فضا کو غزلخواں بنا دیا کس نے

یہ کس نے چھیڑا ہے پردہ شب میں بربطِ گریۂ شبانہ
یہ کس کی آنکھیں برس پڑی ہیں کہ ڈوبتا ہی شرابخانہ

وہ زلف کہسار کی گھٹائیں نظر وہ بجلی کا آشیانہ
لبوں کی جنبش میں داستانِ شباب کا آتشِ فسانہ

نظر میں وارفتگی کی دنیا نفس میں گم گشتگی کا عالم
کہاں کریں بے خودی میں سجدہ جبیں ہے باقی نہ آستانہ

اٹھا پیالہ جھکی صراحی وہ رقص میں آ گیا زمانہ
کہ مستئ شب ہے چشمِ ساقی میں جھومتا ہی شرابخانہ

کمال مستی میں رندِ بے باک کہہ گیا بات محرمانہ
نہ صد شکوہِ سپاہ دولت نہ یک نگاہِ قلندرانہ

یہ بربطِ دل پہ کس نے چھیڑا، جو اپنوں کا حسیں ترانہ
مچل کے انگڑائی لے رہا ہے نگاہ میں بادۂ شبانہ

وہ مست مست نگاہیں ہجومِ نشہ و خواب
ابھی ستارہ ستارہ ابھی شراب شراب

وہ چاند چاند بدن جیسے موتیوں کی دوکاں
گھلی گھلی سی شفق ہے کہ عارضوں کے گلاب

فسانۂ شب ہستی وہ زلف تیرہ و تار
کہ جیسے جنبش بال پری میں لذت خواب

کرن وہ پھوٹی ہوئی نیم باز آنکھوں سے
کہ جیسے ٹوٹا ہوا تارا کوئی شب مہتاب

کھلے کھلے ہوئے مستی میں تا کمر گیسو
وہ جسم جیسے کھلے میکدے شب مہتاب

وہ جھومتا ہوا قد وہ حدیثِ سروِ رواں
حکایت لب شیریں وہ لرزشِ مئے ناب

جو غم میں جان سے گذر جائیں ہم غنیمت ہے
رہیں جو عشق میں ثابت قدم غنیمت ہے

کرم نہیں نہ سہی یہ ستم غنیمت ہے
ہم ان کو یاد تو ہیں کیا یہ کم غنیمت ہے

نفس کی آمد و شد کا کچھ اعتبار نہیں
جو تری یاد میں گذرے وہ دم غنیمت ہے

شراب وصل نہیں زہر غم سہی ساقی
یہ تلخی شب غم ہے تو کم غنیمت ہے

کسی کی زلف سے وابستہ خیال تو ہوں
جو صبح وصل نہیں شام غم غنیمت ہے

حرم کو جاتے ہوئے تھک کے بیٹھنے والے
ملے جو راہ میں بیت الصنم غنیمت ہے

متاع درد کو سود و زیاں سے کیا مطلب
جو اس دکاں سے ملے بیش و کم غنیمت ہے

چمن چمن ہے مرا گھر تمہارے آنے سے
مجھے یہ جنت نقش قدم غنیمت ہے۔

غزلیاتِ فارسی

من کہ با گردشِ پیمانہ غزل میگویم — بارک اللہ چہ رندانہ غزل میگویم
من بہ خاکِ درِ جانانہ غزل میگویم — من ز الطافِ کریمانہ غزل میگویم
میکشاں بو درِ میخانہ غزل میگویم — منِ دیوانہ چہ رندانہ غزل میگویم
حرف شوقم کہ بگوشِ تو رسیدن خواہم — گہ بہ صحرا گہے در خانہ غزل میگویم
تا سحر شمع صفت گریہ کناں میسوزم — من بہ خاکسترِ پروانہ غزل میگویم
گل بیا پاشید سرِ راہ و گلاب افشانید — سرخوشم تا درِ جانانہ غزل میگویم
گل فشانم زلبُ بادہ بجام اندازم — ہمچو مینا سرِ پیمانہ غزل میگویم

اے ضیا ارطورِ دلم جلوۂ جانانہ بسوخت
تا بہ اندازِ حکیمانہ غزل میگویم

تمام جلوہ ام و چشم انتظارم نیست — تمام گل شدہ ام فرصتِ بہارم نیست
ز فرق تا بقدم مستی فراوانم — محیط مے شدم اندازۂ کنارم نیست
مرا کہ دامن و جیب است خونفشاں از تو — سرِ بہار و تماشائے لالہ زارم نیست
کدام جلوہ کہ ساقی بکارِ من نہ نمود — کدام گل کہ بہ آغوشِ نو بہارم نیست
بیا و رخصتِ نظارہ دہ بہ نرگسِ مست — ببیں کہ بادہ بہ اندازۂ خمارم نیست
ہجومِ لالہ بہ بیں و شرابِ ناب بیار — رسیدہ عہدِ گل و تابِ انتظارم نیست

چراغِ بادہ بر افروز و روئے ساقی بیں
کہ غیر شاہد و مئے عمر در شمارم نیست

جوئے آبم از گلستان آمدہ — آئینہ در شہر خوبان آمدہ
شاہدِ گل سوئے بستان آمدہ — موسم چاکِ گریبان آمدہ
چاکِ داماں وگریبانم ببیں — بوئے پیراہن زکنعان آمدہ
گل بداماں۔ گل بکف، گل درکنار — نکہتم از زلفِ خوبان آمدہ
از سقانی الحب کاسات الوصال — مستی ام از شاہِ جیلان آمدہ

مژدہ باد اے تشنہ گانِ معرفت
بادہ از جوشم بہ طوفان آمدہ

ز عشق غالیہ موئے ہوائے چوں بسر دارم — تو گوئی صد بہار سینستان در نظر دارم
بیادِ حسنِ گندم گوں تو ای ہمدم چہ میپرسی — مثالِ دانۂ گندم شگافِ در جگر دارم
مرا باور نمی آید از و حرفِ وفا قاصد — دروغِ مصلحت آمیز میگوئی خبر دارم
بیادِ شوخ کج ابرو چہ می پرسی تو اے ہمدم — شب غم من بجائے تکیہ بر شمشیر سر دارم
بکنعانِ دلم باز آ دمے اے یوسفِ خوبی — کہ من یعقوب آسا دیدہ ہائے بے بصر دارم
بیادِ زلفِ مشکینش بر آرم از جگر دودے — بعشق سرمۂ چشمش ز لب گفتار بردارم

ضیاء را صدقۂ روئے ضیاء بارات ضیائے دہ
کہ اے شمس الضحیٰ ائے من دل تاریکتر دارم

هر لحه طورم هر لحظه مینا　　آتش بجانم از چشم بینا
محو تماشا غرق تجلّی　　یاران خرابم بی جام و مینا
از جان خریدم بر دل گرفتم　　سنگ که آمد بر آبگینه
از تندی مئے شیشه گدازم　　چوں نشه افتم بیرون زمینا
بر سبزه اُفتم بر لاله غلطم　　افتان وخیزاں زینه به زینه
از جم رسیده ایں مے به جامم
ایں نشه آمد سینه به سینه

از مسیحا چرا شفا طلبیم　　ماکه از درِ تو دوا طلبیم
خضر ظلمات خویشتن گردیم　　ما ز خود چشمۂ بقا طلبیم
آبِ حیواں خوریم از لبِ تو　　وز نگاه تو کیمیا طلبیم
از خودی تا خدا رسیم آخر　　ماکه از خویشتن خدا طلبیم
اے که موجود غیر تو معدوم　　غیر تو دیگر از کجا طلبیم
غایت فقر ما جهانبانیست　　تخت شاهی ز بوریا طلبیم
ما سرورِ شراب و نغمه و چنگ
از دو یک شعر تو ضیاء طلبیم

قطعات

میرے میخانے کو حاصل ہے دوام اے ساقی
فیض مستی سے ہے باقی مرا نام اے ساقی
تو میرے جامِ سفالیں کو حقارت سے نہ دیکھ
میں جمِ وقت ہوں دل ہی مرا جام اے ساقی

کیا خبر ہے تجھے اے آتشِ دل سے محروم
پوچھ بلبل سے کہ یہ آگ ہے گلزاروں کی
آج تک میکدہ آباد ہے اُن کے دم سے
ہے یہ اک زندہ کرامت ترے میخواروں کی

بھیگے ہوئے گیسو ہیں سیاہ مست گھٹائیں
طغیانِ جوانی یہ مے آلود ہوائیں
یہ بارشِ گل سیلِ جنوں سجدۂ وحشت
یہ کفر مقدس یہ صنم ساز فضائیں

مہکی ہوئی نظروں میں وہ نیندوں کا بسیرا
شانوں پہ سیہ زلف کا وہ ابر گھنیرا
خورشید پرستوں کو ضیا، یاد ہے اب بھی
جاگا ہُوا سیمائے جوانی کا سویرا

پھوٹ پڑتا ہے جس طرح نغمہ
دل میں اُمید گنگناتی ہے
ترے چہرے سے آرزو میری
چاندنی بن کے مسکراتی ہے

یہ مہکتے ہوئے عارض یہ دمکتی سی جبیں
ایک میخانہ جہاں کیف نظر جاگ اُٹھے
مدبھری آنکھوں میں ڈوبے ہوئے نیندوں کے چراغ
جیسے خوابوں کے جزیرے سے سحر جاگ اُٹھے

میری خوابوں کی اے حسین دنیا
تیری تعبیر کر نہیں سکتا
جیسے آوارہ گلشنوں سے کوئی
شعر کا جام بھر نہیں سکتا

قطعات

مہ جیلی نگارِ گلستانے — نگوں بر آستانش آسمانے
دمادم از شرابش مست گشتم — چہ خوش ساقی چہ خوش پیرمغانے

شہ جیلاں متاعِ کاروانم — غبارِ خاکِ راہش آسمانم
فدائے تارِ مویش ہر دو عالم — نثارِ عارضش عمرِ روانم

نہ میرِ کارواں نے شہسوارم — غریبِ شہرم و یک خاکسارم
زدم دستِ بدامانِ کریمی — زلطفش بے نیاز شہریارم

گہے خنداں گہے گریاں شدم من — گہے چوں آئینہ حیراں شدم من
زخود رفتم گہے تا خود رسیدم — گہے پیدا گہے پنہاں شدم من

نہاں در خاکِ من صد لالہ زار ست — سراپا مستی ام نقشِ بہار ست
زفیضِ دوست سرشارِ مدامم — بحمد اللہ کہ یارم در کنار ست

بہار آمد گلستاں در گلستاں — بہر سو آتشِ گل شد فروزاں
دمے بنشیں کنارِ جوئبارال — قدح پُر کن بصوتِ عندلیباں

چوں موج اندر ہوائے ماہتابم — چو ذرہ ہمنشیں آفتابم
رہیدم از خودو تا خود رسیدم — قدح گیرید یاراں از شرابم

رباعیات

دل جھوم اٹھا جو ابر پارے جھومے
آنکھوں میں محبت کے شرارے جھومے
نظارہ بہ نظارہ چلا جام بہ جام
ہم گردنِ مینا کے سہارے جھومے

شب بھر فضا میں گیسو مہکتے ہی رہے
رقصاں تھی حیات جام کھنکتے ہی رہے
لو دیتی رہیں شرارِ زندگی کی شمعیں
ماحول میں جگنو سے چمکتے ہی رہے

گر تاکِ فلک خوشۂ پرویں نہیں دیتا
ساقی بھی اگر بادۂ رنگیں نہیں دیتا
فطرت مجھے دیتی ہے نظاروں کی شرابیں
اک جام اگر وہ کفِ سیمیں نہیں دیتا

اے زندہ دلوں کی شام آہستہ گذر
اے پرتوِ زلف و جام آہستہ گذر
ہاں چھاؤں میں زلفوں کی ذرا سستا لوں
اے جنتِ خوش خرام آہستہ گذر

مہکی ہوئی زلفوں کا پیام آیا ہے
مجھ رندِ سیاہ مست کے نام آیا ہے
کیوں گردنِ مینا میں نہ ڈالوں باہیں
حلقے میں شبِ ماہ کے جام آیا ہے

پھر قافلۂ ابر رواں ہے ساقی
دل سینے میں اک برقِ تپاں ہے ساقی
ساون کے یہ دن اور یہ بھیگی راتیں
ہر بوند مجھے رطلِ گراں ہے ساقی

ہوں مست تو لائے امیر اے ساقی
لا ساغرِ صہبائے غدیر اے ساقی
حیدر کا جو دشمن ہے میرا دوست نہیں
اٹھا ہے اسی مئے سے خمیر اے ساقی

رباعیات

دستے بکنارِ ماہ رویاں خواہسم	دستے دگرے بہ زلفِ حوراں خواہم
چنگم بہ کنار وگا چشم بہ شراب	اے عمرِ رواں۔ عہدِ بہاراں خواہم

دریاب کہ شد فصلِ بہاراں ساقی	بلبل بہ چمن گشت غزلخواں ساقی
اے بے تو مرا چشمِ تمنا گریز	وز خونِ جگر دیدہ گلستاں ساقی

در کوہ و خرابۂ صحرا گریم	باید کہ باندازۂ دریا گریم
چوں خندۂ اربابِ طرب می نگرم	خواہسم کہ بیک گوشۂ تنہا گریم

ساقی بقدح شعلہ نمناک انداز	بر آتشِ غم آب طربناک انداز
در دیدہ شود خاک ہوائے کونین	در سینہ ام آں جلوہ بیباک انداز

برخیز کہ دامانِ نگارے گیریم	مستانہ ز کونین کنارے گیریم
جز دوست بسوزیم ہمہ رختِ حیات	وز آتشِ دل برق و شرارے گیریم

اے نفسِ فرومایہ پشیماں نہ شدی	وے کافرِ دیرینہ مسلماں نہ شدی
در ظلمتِ تن خضر نہ گشتی بارے	حیواں ماندی و واقفِ حیواں نہ شدی

سامانِ بہار می باید کرد	درمانِ خمار می باید کرد
ابرست و شراب می باید خورد	وز توبہ کنار می باید کرد

ضیاء منزل شیخ الاسلام گنج پشاور شہر